گنجہائے گرانمایہ

رشید احمد صدیقی

گنجہائے گراں مایہ

گنجہائے گرانمایہ

مصنفہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی
صدر شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ناشران
آئینۂ ادب۔ چوک مینار۔ انارکلی لاہور

بار ششم
۱۹۶۷ء
تعداد: گیارہ سو

اہتمام
م، ع، اسلام - آئینۂ ادب
چوک مینار، انارکلی لاہور

(اشرف پریس لاہور میں طبع ہوئی)

فہرست

۹ - سیّد محفوظ علی بدایونی مرحوم
۱۰ - نصیرالدین علوی مرحوم
۱۱ - سیّد سجاد حیدر یلدرم مرحوم
۱۲ - سر سلیمان مرحوم
۱۳ - شیخ حسن عبداللہ مرحوم

مولانا محمد علیؒ

ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی !
عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک برگزیدہ حقیقت بنا دیا —— سنگین اور صالح !
محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے —— صحیح اور گرانمایہ !

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے جو کسی کی زندگی میں نہیں ہوتے لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پر شوکت بنا دیا۔

محمد علی کو بد توفیقوں اور بد مذاقوں سے سابقہ پڑا۔ ایسے بد توفیق اور بد مذاق جو بھوکے تھے بوالہوس اور کینہ پرور بھی۔ محمد علی نے ان سب سے انتقام لیا لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے ہماری قومی زندگی میں آج کتنے دھارے بہہ رہے ہیں، کتنے چشمے اُبل رہے ہیں کتنے عزائم بیدار اور کتنی روحیں دار و رسن کی طلب گار ہیں! یہ کس کا فیضان ہے۔ محمد علی نے ہمارے خون کو رگوں میں دوڑنا پھرنا ہی نہیں بتایا بلکہ وہ آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں! مردِ غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہماہمی و طرب انگیزی، برگستواں کی زینت تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرہ ——— ڈوبتے ہوئے سورج سے!

محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح تابندہ و تپاں ـــــ بشارت ازلی بھی - حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف تھے کیسی مخالفت! اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد، نفس پروری اور تن آسانی کے لیے وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں، لومڑی اور بھیڑیوں سے سابقہ ہو - بشارت ازلی اس لیے کہ شخصیت کامیاب رہی - شخص کا انجام ناقابلِ التفات توفیقِ انسانی اور تقدیرِ الٰہی اکثر برگزیدہ افراد کی ناکامی میں جلوہ گر ہوتی ہیں - اسے ناکامی نہیں کامرانی بتایا گیا ہے -

---

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی - وہ تیغِ اصیل تھی جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری -

وہ مخالفت اور مقابلہ میں بے باک اور بے پناہ تھے - وہ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے - اُن کو پناہ دیتے تھے - ان کی دل دہی اور دل آسائی کرتے، اُن کے لیے مارنے مرنے پر تیار رہتے، محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی - ان کی مدد لینے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری ساری فلاکت و ہلاکت محمد علی کی، اور کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی!

وہ آغوشِ مادر، بازوئے برادر اور راحتِ عزیزاں تھے!

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے، بولتے تو معلوم ہوتا بوالہول

کی آواز اہرامِ مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کہ رپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہان کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پہ آتے اور بولتے ہوئے سُنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو دلو دی ہے۔ ع

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھپٹتے بل کھاتے پہنچتے، جس کڑک تڑپ، غرّ پو اور غلبہ سے بولتے وہ میں نے دیکھا ہے۔ وہ بولنے میں تلوار اور گُرز دونوں سے کام لیتے۔ وہ دُنیا کے ہر حربہ کا جواب اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔

محمد علی پر دولت و شہرت کی بارش ہوئی۔ محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب بنا کر بہا دیا۔ دونوں نے مفارقت کی۔ بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا۔ لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں۔ ان کی روح پاک تھی — ظاہر کیا معلوم زندہ رہتے تو کیا ہوتا۔ بوریائے بوذرؓ اور سریرِ سلیمانؑ کو یکساں سمجھنے والے کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے!

محمد علی کی موت کا حال جب میں نے سُنا تو تھوڑی دیر کے لیے یقین نہیں آیا۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طور پر کیا —— خود موت پہ کیا گزری ہوگی!

پھر سوچنے لگا کہ اگر محمد علی کی بجائے قضا و قدر یہ چارہ کار پیش کرتے کہ اچھا محمد علی کی بجائے ہندوستان کے کسی اور مسلمان لیڈر کو حوالہ کر دو۔ یہ سوال آتے ہی خدا جانے یہ فیصلہ دل میں کیسے آیا اور انتہائی قطعیت کے ساتھ کہ محمد علی کے بدلہ میں ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جا سکتا تھا۔ اور اس کا ماتم نسبتاً کم ہوتا! لوگ آزردہ نہ ہوں۔ انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں۔ انہی خیالات کو کبھی الہام قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ مہمل بھی ہوتے ہیں لیکن خیال کے عجیب تر ہونے کے معنی ہمیشہ مہمل ہونے کے تو نہیں ہیں۔ محمد علی میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن ان کی کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح و شکست تو اسی لیے بنائے گئے ہیں کہ فتح و شکست ہوتی رہے لیکن جنگ آزما کہاں ہے۔ شہادت کس کو نصیب ہوگی، ایسا حسینؓ کہاں جس کی خود یزید کو تلاش ہو!

آئیے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا۔ وہاں آج محمد علی کی معراج منائیں!!

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

ڈاکٹر انصاری مرحوم

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم

ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تو یہ
سوال فوراً زبان پہ آتا تھا ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جب
کہ ڈاکٹر انصاری کی رحلت کی خبر آئی تو تھوڑی دیر تک عقل و حواس معطل
رہے، سوچنے لگا آخر ڈاکٹر انصاری کیوں جا کہ جاں بحق ہوئے اور یہ
کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے لیے اس موت کا سدِ باب نہ کر سکے
جس کو ان کی نتھری، چمکیلی، گہری اور مریض اور تندرست دونوں کو
تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روک دیتی تھیں ٹال دیتی تھیں اور بھگا

دیتی تھیں۔

میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے اپنی تکلیف میں رجوع کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی مٹیالی، نم ناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو، اُس وقت میں اُن کے مطب کا رُخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن کے انتظار کے کمرہ میں بیٹھا، فتحپوری کی دکانوں، گزرنے والوں کی تگ و دو، گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر بہر، یہ مشغولیت، یہ خلفشار زندگی ہے جس سے میں ہمیشہ کے لیے علیٰحدہ کر دیا جاؤں گا، زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی ہے تو مجھ پر ہراس، مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا اور میں زیادہ بے تابی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہو جاتا۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی، وہ اپنے مضبوط اور ہموار قدموں سے زینہ پر چڑھتے اور کسی ہمراہی سے گفتگو کرتے ہوئے سنائی دیتے۔ دیکھتے ہی مسکراتے، اس طور پر کہ گھنی پلکوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں بھی مسکرانے لگتیں۔ کہتے، بھئی تم کہاں، بڑے عرصہ تک غائب رہے، میں کہتا ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہے، پریشان ہوں کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ بولتے گھبراؤ نہیں ابھی دیکھتا ہوں، پریشانی

کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں اس لب ولہجہ سے اور اس طرح ہنس ہنس کر
اعتماد اور اعتقاد، دل آسائی اور دل ربائی کے ساتھ دوستی اور بزرگی کی
شان سے کہتے کہ مجھے خود محسوس ہونے لگتا کہ میں ناحق پریشان ہوا۔ اس سے
پہلے کیوں نہ آیا۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا، اس سے بات کرتے
جاتے، اندازِ گفتگو سے محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے سے بات اس لیے کر رہے
ہیں کہ مجھے تقویت پہنچے اور مجھ سے گفتگو کرتے تو اوروں کو محسوس ہوتا کہ
وہ دوسروں میں بھی اعتماد اور اُمید کی روح بیدار کر رہے ہیں۔ اُن کے
ساتھ صرف مریض یا اُن کے اعزا نہ ہوتے بلکہ مختلف اقسام کے لوگ ہوتے۔
مقاصد کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی لیکن ڈاکٹر انصاری کی بات میں وہ
جادو تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا کہ گو ڈاکٹر انصاری مخاطب دوسروں سے
ہیں لیکن کہہ وہی رہے ہیں جو ہماری تقویت یا دلچسپی کا موجب ہو۔

ڈاکٹر انصاری اپنے معائنہ کے کمرہ میں لے جاتے۔ مجھے اس قسم کے
معائنہ خانوں اور اپریشن روم وغیرہ میں جانے کا اکثر اتفاق ہوا ہے لیکن
جس اُمید اور اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر
بھاٹیا (لکھنؤ) کے حوالہ کیا ہے وہ مجھے کہیں اور نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر
انصاری اس طرح دیکھتے ٹٹولتے گویا وہ خود اپنے زخم یا درد کو ٹٹول رہے
ہیں۔ اُن کی اُنگلیاں، خوب صورت، سڈول، گداز، پاکیزہ، خوش رنگ
اور ایسی معتدل حرارت کی ہوتیں اور اُن کو وہ اس نرمی اور نزاکت سے

ساتھ کام میں لاتے کہ مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کسی دوسرے کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی ہیں۔ آہ ان کی گھنی ابروئیں اور لمبی پلکوں والی گہری، روشن اور ہنستی ہوئی آنکھیں اور شیر و شہد سی نگاہیں جو جسم و جان میں اس طور پر نفوذ کرتیں جیسے کوئی اچھا خیال یا اچھا کام قلب کو بالیدہ، جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کر دیتا ہے۔ وہ مریض کا معائنہ اس طرح کرتے جیسے وہ ان کا جان چھڑکنے والا بھائی، چہیتا بیٹا یا جاں نثار دوست ہے۔ اُن کی پیشانی ایک روشن فضا تھی۔ جس میں مریض کو امید اور بر آنے والی امید کے نقوش نظر آتے تھے۔

معائنہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا گویا ڈاکٹر انصاری کو آج تمام دن کوئی اور کام کرنا نہیں ہے اور اسی مریض پر تمام وقت اور توجہ صرف کر دیں گے۔ معائنہ ختم کرنے کے بعد میز پر لیٹے ہوئے مریض کو خود سہارا دے کر اٹھاتے کچھ دیر تک اسے میز پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھا رہنے دیتے۔ اور خود اُس کے پاس کھڑے ہو کر اس طور پر باتیں کرتے جیسے اپنے کسی گہرے بے تکلف دوست سے خوش گپی کر رہے ہوں۔ اس کے بعد سہارا دے کر میز سے اُتارتے کپڑے پہنانے میں مدد دیتے، نسخہ لکھتے استعمال کی ترکیب بتاتے اور رخصت کر دیتے۔

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہے گی۔ چنانچہ میں مطب سے اُترتے ہی فتحپوری اور چاندنی چوک

کی چہل پہل اور ہماہمی میں گم ہو جاتا پھل والوں کے ہاں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتا اور مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھو چکا ہوتا اس کو بد پرہیزی سے از سر نو حاصل کرتا دل کا اندوہ چھٹ جاتا اور زندگی خوشگوار اور خوش آئند ہونے لگتی ۔

میں نے ایک بار ڈاکٹر انصاری کو سرجری کرتے بھی دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ماہر مصور کے ہاتھ میں موقلم ہے یا کوئی مرصع ساز کسی نازک زیور یا مشین پر کام کر رہا ہے ۔ نشتر اُن کی اُنگلیوں میں اس طور پر کام کرتا جیسے بہزاد اپنے قلم سے خطوط کھینچ رہا ہے ۔ نزاکت اور صلابت دونوں کا امتزاج ، ایسا امتزاج جو قوسِ قزح کے رنگوں میں پایا جاتا ہے ۔ چہرہ پر سنجیدگی ۔ آنکھوں میں گہرائی ۔ انگلیوں میں صفائی اور تیزی اپریشن میں آلودگی کا ہونا لازمی ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کو اپریشن کرتے دیکھئے تو معلوم ہوتا جیسے مشین کا ماہر مختلف ٹکڑوں کو جو اسکرو سے جڑے ہوئے ہیں خوبی پھُرتی صفائی اور اعتماد کے ساتھ علیحدہ کر رہا ہے ۔

مدتیں گذریں میری طفولیت اور الہلال کے شباب کا زمانہ تھا الہلال کے جتنے پرچے آتے تھے ہم لوگ اس کو شوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے ۔ عبارت سمجھتے تو فخر کرتے اور جہاں نہ سمجھتے وہاں یہ خیال کرتے کوئی بڑی بلند یا گہری بات کہی ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لیے ہم اس کا اور زیادہ احترام کرتے پچھلی بار گھر گیا بچپن کے زمانہ کی الماری گرد و غبار

سے اٹی پڑی تھی ایک کاغذ پر اتفاقیہ نظر جا پڑی دیکھا تو اس وفد کی تصویر تھی جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سرکردگی میں جنگ بلقان میں زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے ہندوستان سے گیا تھا یہ تصویر اس زمانہ میں الہلال میں شائع ہوئی تھی۔ نیچے لکھا ہوا تھا۔

"اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو
جب وہاں پہنچنا تو خدارا اُن کے زخموں پر سختی
نہ کرنا۔ کیونکہ وہ زخم ان کے نہیں ہیں بلکہ اسلام
کے ہیں۔"

وہ زمانہ یاد آ گیا جب ابوالکلام، محمد علی، ڈاکٹر انصاری کو ہم سب خدا جانے کیا سمجھتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پر تیرہ سو برس نہیں گزرے ہیں۔ بڑے ہو کر ہم بھی ہندوستان سے باہر جا کر مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے زخمی ہوں گے شہادت پائیں گے فاتح کہلائیں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ اسلام اور اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور منزلت نہیں ہے۔ آج جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ ماضی کا غبار زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا اور تصور کی کرنیں طفولیت کے اس افق پر پڑ رہی ہے جہاں ہم رہ رہ کر تلملا اٹھتے تھے کہ کیوں بچپن کا زمانہ نہیں ختم ہوتا اور ہم ترکوں کی مدد کے لیے اسلام کا نام روشن کرنے کے لیے زخمی ہونے کے لیے سپاہیوں کی صف میں کھڑے ہونے کے لیے کیوں نہیں بلائے جاتے، لیکن اب کیا حال ہے؟ ہم بدل گئے زمانہ بدل

گیا۔ دُنیا بدل گئی۔ رنج و راحت، عزّت و ذلّت کا تصوّر بدل گیا۔ زندگی کی جدوجہد وہی ہے۔ لیکن جدوجہد کا لُطف باقی نہیں رہا تصوّرات میں نہ رنگینی باقی رہی نہ حرارت، عزائم میں نہ استواری ہے اور نہ برکت! مانا کہ موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات کچھ اور ہی ہیں فرائض اور ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن خدارا کوئی یہ بتائے یہ کیسے مسائل ہیں یہ کیسے فرائض ہیں جن سے دماغ میں روشنی نہیں پیدا ہوتی، دلوں میں ولولے نہیں پیدا ہوتے، ہاتھوں میں قوّت نہیں پیدا ہوتی اور زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے پرانے وقت کا ہوں، راگنی بے وقت کی ہے، زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ زندگی اور زندگی کے تار پود نئے اسلوب سے مرتّب ہو رہے ہیں ہر چیز کی قدر و قیمت گھٹ بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کو ہم متاعِ بے بہا سمجھتے تھے وہ متاع کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم خجل اور سراسیمہ ہوتے ہیں وہی حاصل حیات ہے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رُخ بھی بدل گیا ہے لیکن زندگی کی برہنگی کو برگزیدہ حقائق کا انکشاف کیوں کر مانا جائے۔ سائنس کے کرشموں کو انسانیت کی معراج کیسے قرار دیا جائے۔ آرٹ اور آزادی کی قربان گاہ پر کن سعادتوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ افراد کی شادی اور غمی کیا ہو گی۔ ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگ زار سے افراد کی امید اور اُمنگ کے نخلستان کیوں فنا کئے جا رہے ہیں، زمانہ کے بدلنے سے زندگی

کی سئیات، حسنات میں کیوں کر تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انصاری ہندو مسلمانوں کے نفاق و افتراق کو دور کرنے کی فکر میں تمام عمر کوشاں رہے۔ وہ نفاق و افتراق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مرض سمجھتے تھے اور ایک سچے طبیب اور ڈاکٹر کی مانند مریض سے ہمدردی کرنے اور مرض کے ازالہ میں پوری توجہ اور دلسوزی اور قابلیت صرف کرتے رہے۔ انھوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہندو یا مسلم کی حیثیت سے نہ کبھی پرکھا اور نہ اس کی چارہ سازی کی انھوں نے اس مرض کے ازالہ کی ایک حقیقی طبیب کی حیثیت سے کوشش کی۔ ڈاکٹر انصاری کے لیے اس کے علاوہ اور چارۂ کار ہی نہ تھا۔ وہ جب کرتے جیسا کچھ کرتے اور جتنا کر سکتے سب طبیب ہی کی حیثیت سے کرتے اور ایسا ہی انھوں نے کیا۔

ڈاکٹر انصاری کی وفات سے کتنے لڑکے لڑکیاں یتیم ہو گئیں۔ بیوائیں لاوارث ہو گئیں۔ نوجوان بے دست و پا ہو گئے۔ رفقا جی چھوڑ بیٹھے۔ وہ معلوم نہیں کن کن مواقع پر کیسے کیسے لوگوں کی مدد کر چکے تھے۔ اس بڑے پہیئے کی گردش سے کتنی چھوٹی چھوٹی اور مختلف متفرق مشینیں گردش کر رہی تھیں وہ محتاجوں ہی کے مددگار نہ تھے بلکہ اُن لوگوں کی آن بان اور وضع داری کے بھی کفیل تھے جن کو "آسیائے گردشِ ایام" برابر پیستی جاتی تھی۔ ایسوں کی دستگیری معمولی کام نہ تھا۔ دولت، اثر، اقتدار کا

کتنا بڑا حصہ ان پر صرف ہوتا ہوگا بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے ہر قسم کی مدد، انتہائی کشادہ جبینی اور دریا دلی کے ساتھ دوسروں کی کی ہوگی اور شاید کوئی ایسا نہ ہو جس سے اسی نوعیت کی مدد ڈاکٹر انصاری نے حاصل کی ہو۔

انھوں نے خوب کمایا، خوب صرف کیا۔ ان پر ایسے ایسے مواقع بھی آئے جب اُن کے پاس کھانے اور خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں کسی ایسے کو جس کے کفیل ڈاکٹر انصاری تھے۔ کبھی کسی ایسے موقع سے دوچار نہیں ہونا پڑا جب اس کو کھانے اور خرچ کرنے کی سختی جھیلنی پڑی ہو ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے ڈاکٹر انصاری کی اتنی مدد کی ہو جتنی ڈاکٹر انصاری نے اس کی کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لوگ جن پر ڈاکٹر کے احسانات تھے ڈاکٹر کے لیے کیا کرتے ہیں۔ ڈر صرف اسی سے ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اکثر و بیشتر صرف یہ کرتے ہیں کہ مدد لینے میں تو حق و ناحق کی تمیز اٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دینے کے وقت اُس حالت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں جب خود ہم کو مدد مانگنے کی ضرورت ہوئی تھی اور ہماری مدد کی گئی تھی۔

ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے قیام و ترقی میں جو کچھ کرتے رہے اُن کی جو امیدیں اور ولولے اس سے وابستہ تھے اس کا اندازہ میں کر سکتا ہوں غالباً چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو مجھ سے زیادہ اس کا احساس کر سکتے ہوں۔ ابھی ابھی رمضان کی ایک شام کو ذاکر صاحب[1] کے ہمراہ جامعہ کی نئی عمارت

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ، دہلی

دیکھنے اور کھلے جانے کا اتفاق ہوا۔ اور کھلے کے صاف اور سادے ورق پہ ایک نقش اُبھر رہا تھا، بدیع اور بلند عمارت کے نقشہ پر دیوار و در کہیں کہیں سے نمایاں ہونے لگے تھے تصوّر تصویر میں منتقل ہو رہا تھا۔ مستقبل کا اُفق دھیرے دھیرے ان تمام گہرائیوں اور پہنائیوں کے ساتھ بے نقاب ہو رہا تھا۔ جن میں مومن کا عزم پرورش پاتا ہے۔ بالیدہ ہوتا ہے اور آفاق پر چھا جاتا ہے۔

عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک طرف ڈاکٹر انصاری آسودۂ خاک تھے اور مدفن کے بہشتی جھروکے سے اپنے حسنات کی فردوس تعمیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

دیر ہو رہی تھی ہم سب واپس آگئے!

مولانا سلیمان اشرف صاحب

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مولانا سلیمان اشرف صاحب اس جہان سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ وہ تمام باتیں لے گئے جو میرے لیے اب کسی اور میں نہیں۔ میرا اُن کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا، صرف علی گڑھ کا رشتہ تھا لیکن کس سے کہوں اور کون سمجھے گا کہ اس رشتہ میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ وہ میرے لیے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست۔

پریشان ہوتا تو ان کے ہاں جاتا، جی گھبراتا تو وہاں جاتا، خوش
ہوتا تو وہاں ضرور جاتا —— اور جب کہیں نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا۔
گھنٹوں بیٹھتا کوئی معمولی جان پہچان یا تعلقات کا آدمی پہلے سے موجود ہوتا
تو اسے رخصت کر دیتے، کوئی اچھا ملنے جلنے والا موجود ہوتا تو اسے اُٹھنے
نہ دیتے۔ جو کچھ موجود ہوتا اس سے ضرور تواضع کرتے۔ ایسا کبھی نہ ہوا
کوئی چیز موجود نہ ہو مجھے چائے کا شوق نہیں، مرحوم اس کے بڑے شائق
تھے اور بڑے تکلف سے پیتے، اصرار سے ایک پیالی دیتے، کہتے پی لو۔
پھر گپ ہو گی۔ ایک پان کھاؤ دوسرا مجھے بنا کر دو۔

میں کہتا آپ کے ہاں چائے میں نہ شکر نہ دودھ پھر کیسی ہو گی؟
کہتے میرے لیے پیتے ہو یا اپنے لیے؟ میں نے دبی زبان سے کہا بیوی بچوں
کا بھی تو خیال ہے۔ فرمایا کبھی کبھی بیوی بچوں سے الگ رہ کر بھی زندہ رہ
لیا کرو۔ میں کہتا آپ دام پوری تمباکو کھاتے ہیں۔ یہ میرے بس کی نہیں۔
کہتے چائے میں دودھ شکر اور پان میں خوشبودار تمباکو کھاتے ہو۔ نشہ
کا احترام کرنا نہ آیا۔ آواز دیتے جمّا! رشید کی پیالی میں شکر ڈالنا پھر
پکارتے، اَچھن، رشید کو تمباکو دو۔ بڑی مزیدار معطر تمباکو ہوتی۔

پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ آج تک یہ نہ پوچھا کیسے ہو
بال بچے کیسے ہیں۔ کیا کرتے ہو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی غیر معمولی بات
ہوتی تو میں خود ہی کہتا یا انھیں پہلے سے معلوم ہوتی۔ کبھی انھوں نے مجھے گھر
سے بلوا نہ بھیجا۔ کیسی ہی ضروری بات کیوں نہ ہوتی اس کے منتظر رہتے

کہ چلتے پھرتے ملاقات ہو جائے گی تو کیا کہہ دیں گے ایسا موقع ہوتا تو صرف چند منٹوں میں بات ختم کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے "اچھا جاؤ"

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دن میں وہ منزلے کے سامنے سے بڑی تیزی سے سائیکل سے گزر رہا تھا۔ سامنے چبوترے پر ٹہل رہے تھے فوراً پکارا ذرا ٹھہرنا میں رکا سائیکل کو چبوترہ سے لگا کر قریب آنا چاہتا تھا۔ فرمایا نہیں نیچے ہی کھڑے رہو۔ ایک بات کہنی تھی وہ تمہارا یار اصغر (اصغر حسین اصغر مرحوم) اب کے الہ آباد کے سفر میں ساتھ ہو گیا تھا کیا شعر کہا ہے۔

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

اس شعر کو اپنے خاص مترنم کسی قدر حزیں لیکن پر وقار لہجہ میں پھر پڑھا کہنے لگے رشید اس شعر کا کہنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ الہ آباد تک ساتھ رہا خوب کڑھا ہوا آدمی ہے اب کبھی آئیں تو ضرور لانا اس شعر کی خوبی کی تفصیل پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت جاؤ خوش رہو!

مرحوم کے ہاں کوئی خاص موضوع گفتگو کے لیے مخصوص نہ ہوتا۔ باتوں ہی باتوں میں ایسے ایسے فقرے اور لطیفے کہہ جاتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی، ہر بات بے ضغطہ زبان کہتے "بے ضغطہ زبان" انہی کا فقرہ ہے۔ کبھی کبھی ایسے الفاظ اور فقرے بھی کہہ جاتے جو ثقاہت کی زبان پر نہیں آتے لیکن اس بے ساختگی سے اور اتنا برجستہ کہتے کہ اس لفظ

کی بدنمائی کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ ان کی باتوں میں حلاوت تھی کبھی کبھی بہار کا کوئی لفظ بول جاتے اور کہہ بیٹھتے کہ یہ خاص ہمارے دیار کا لفظ ہے ایسا جامع لفظ کہیں اور نہ ملے گا۔

کرسی ہو مونڈھا ہو، صوفہ ہو، تخت ہو بیٹھتے ایک ہی وضع سے نیچے پاؤں اٹھا کر اور سمیٹ کر۔ اسی طرح بیٹھ کر چائے پیتے، مطالعہ کرتے، لکھتے اور باتیں کرتے نشست کا ہر طرح کا سامان ہوتا۔ چبوترے سے متصل نیم دائرہ سائبان میں مونڈھے بچھے رہتے، ایک طرف چارپائی بھی ہوتی بڑے سے بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا اس کے لیے کوئی اچھی کرسی یا صوفہ وغیرہ اندر سے نہ نکالا جاتا۔ جو موجود ہوتا اسی پر وہ بھی بیٹھ جاتا۔ اور سارے مجمع کو دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ مرحوم ہی سب پر چھائے ہوئے ہیں کسی سے آج تک مرحوم نے ایسی گفتگو نہ کی جس سے معلوم ہوتا کہ مولانا نووارد سے مرعوب ہیں یا اس سے خاص طور پر مخاطب ہیں۔ بڑے سے بڑے نواب کو بھی میں نے مرحوم کے پاس بیٹھے دیکھا ہے۔ اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن مولانا ہر ایک سے ایک ہی اُتار چڑھاؤ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مولانا کا پرانا جُمّا اسی طرح نواب صاحب کو چائے کی ایک پیالی لا کر دے گا۔ جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو دیتا، وہی بے ضبط زبان گفتگو، وہی نشست، وہی فضا، جس کا جی چاہا اُٹھ کر چلا گیا۔ اسی دوران میں معزز نووارد بھی تشریف لے گئے اور مولانا مرحوم اپنی جگہ پر جوں کے توں باغ و بہار یا کوہِ وقار بنے بیٹھے رہے!

زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن اکثر محسوس یہی ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا۔ کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا کہ اس میں تھوڑا بہت گنوار پن بھی ہے۔ کوئی بڑا عالم فاضل ہوا تو اس میں نخوت، تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی۔ اللہ والے ملے تو انھیں دُنیا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکرِ خدا کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت و عظمت کا تو قائل ہوتا۔ لیکن مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور ہر موقع سے اس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے کہ ان کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ فلاں جگہ کمی ہے جسے پورا کرنے کے لیے کسی اور کو ڈھونڈھنا چاہیے۔

میرا اُن کا بیس بائیس سال سے ساتھ تھا۔ پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں نو وارد و کس مپرس طالب علم تھا، جب ان کا ساتھ چھوٹا ہے تو سب کچھ تھا دوسروں کے نزدیک نہ سہی اپنے نزدیک سہی۔ میں نے بھی اس مدت میں بہت کچھ دیکھا سُنا اور برتا ہے اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ کچھ اعتماد بھی رکھتا ہوں لیکن اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے جو سلوک مجھ سے ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قائم رہا۔ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت و اخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مطابق پایا۔ مولانا کی صحبت سے

جب کبھی اُٹھتا تو معلوم ہوتا کہ میں نے کوئی نئی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پریشان و مایوس ہوا تو ان کی صحبت سے ہشاش بشاش اُٹھا، رنج یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہو گیا خالی الذہن گیا تھا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اُٹھا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔

آج کم و بیش دس گیارہ سال ہوئے۔ یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی بیٹھ چکی تھی بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولانا خاص طور پر زد میں تھے۔ ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی نفسی نفسی کا عالم تھا۔ بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ اُس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں۔ جن پر وہ عالم گزر چکا ہے اُس زمانہ میں میں نے مولانا کو دیکھا کیا مجال کہ روزمرہ کے معمولات میں فرق آ جاتا، جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اُس کا علی الاعلان اظہار کرتے شام کے وقت برآمدہ میں لوگ بیٹھے ہوتے، چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام نشان نہیں کسی کی مجال تک نہ ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ کرتا ایک دن شب میں میں بھی حاضر ہوا، میں مرحوم کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کہنے میں ہمیشہ تامل کرتے تھے، میں نے کہا مولانا کیا ہونے والا ہے۔ خدانخواستہ نوع دیگر ہوا تو کیا ہو گا، کہنے لگے رشید! تم بھی ایسی لغو باتیں کہتے ہو۔ مجھے خیال تھا تم اس قسم کا ذکر نہ چھیڑو گے ہو گا کیا وہی ہو گا جو ازل سے تقدیر میں ہو چکا ہے۔ مومن کی شان یہی ہے

کہ اُس پر ہراس طاری نہ ہو۔ تم ڈر و گے تو اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ جو ہونے والا ہے وہ ہو چکا ہے۔ پھر ڈرنے جھجکنے سے کیا فائدہ؟

مولانا پر اس وقت ایک عجیب جلال سا طاری تھا اور مجھے شہنشاہیت روما کا وہ عہد یاد آگیا جب گالس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشہ میں آکر سینیٹ کا رُخ کیا جہاں کا ہر رُکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشست ہی پر ذبح کر دیا لیکن کسی سینیٹر نے نہ اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ و زاری کی۔

وہ دن گذر گئے، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا، مرحوم بھی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت میں اُس زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کیسا مرد اور کتنا بڑا سردار ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔ تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا اس وقت صرف مولانا کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور ان کے تاریخی دومنزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہوتے تو بھی مولانا کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا!

۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ نان کوآپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے "گائے کی قربانی" اور "موالات" پر بڑے بڑے جبّہ اور مستند

لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اُس زمانہ کے اخبارات نگاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کیا سے کیا ہو گیا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو نہیں سکتی تھی کالج میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم مطعون ہوتے رہتے تھے۔ لیکن چہرہ پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق اُس زمانہ میں میں اسی ڈونلسنز کے عقبی کمروں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم کی نشست کے کمروں میں صرف ایک دیوار حایل تھی۔ جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دن میں کئی بار ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔

کہتے تھے رشید! دیکھو، علما کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھروندا بنا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں اُس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں۔ اور نہ میں ان تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ رہ رہ کر ان ہی باتوں کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مناقشوں کا مرکز بنے، لیکن کیا کروں خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقع ملے گا اس دنیا کے پڑھے لکھے لوگ کیا کہیں گے۔

بالآخر مولانا نے ان مباحث پر قلم اُٹھایا اور دن رات قلم برداشتہ

لکھتے رہتے اکثر بٹھا کر سناتے اور رائے طلب کرتے۔ میں کہتا مولانا میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہیں کہ میں محاکمہ کر سکوں۔ آپ جو کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ کہتے یہ بات نہیں ہے تم پر اس ہڑ گم کا اثر ہے اور سمجھتے ہو کہ یہ تمام علما جو کچھ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور میں کالج کا مولوی یوں ہی ہانکتا ہوں یہ بات نہیں ہے، ہم تم زندہ ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر!

سیلاب گزر گیا۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا، آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے سارے علماً سیلاب کی زد میں آ چکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے۔ اس کا اعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مولانا نے کہا کہ میں نے یا آپ نے مولانا کی اس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔ ایک دفعہ میں نے دریافت کیا تو مرحوم نے ہنس کر فرمایا۔ لیکن میں آن کلمات کو دُہرانا نہیں چاہتا۔ اس سے بدمزگی اور پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے!

تیس سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا، جونپور میں سیرتِ رسولؐ کا جلسہ تھا، مرحوم کی تقریر ہو رہی تھی جلسہ کیا ایک جم غفیر تھا، مرحوم اپنے مخصوص والہانہ جوش و وارفتگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے، حاضرین کی خاموشی کا یہ عالم تھا جیسے سارا مجمع ایک ہی متنفس تھا۔ اتنے میں دور

سے ایک بوڑھا پستہ قد منحنی شخص جھکا ہوا ، انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا۔ جس شخص کے پاس سے گزرتا ہے وہ خوف و عقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا ہے ۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا مرحوم کو سینہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا ۔ یہ مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جبروت جونپوری مرحوم کے استاد اور جونپور میں اس وقت علم و فضل کے چشم و چراغ تھے ۔

مرحوم میں اپنے استاد ہی کا جبروت و طنطنہ تھا ان کی شفقت میں بھی جبروت کارفرما تھا ۔ میں نے مرحوم کو جھجک کر یا گول مول باتیں کرتے کبھی نہ پایا ۔ ایک بار میں مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا ۔ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے آدمی نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا مولانا برائے نوازش آج شب کا کھانا غریب خانہ پر تناول فرمایئے مولانا نے بغیر کسی تامل کے بے لاگ کہا نہیں جناب میرا آپ کا کھانے کا کھانا نہیں ہے یہ نہیں ہو سکتا ۔ وہ صاحب بڑے خفیف ہوئے لیکن مرحوم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا ہم سب سخت متحیر ہوئے آخر میں مرحوم نے فرمایا جی ہاں میرا ان کا کوئی کھانا نہیں ہے اس قسم کے اتنے اور واقعات ہیں کئی سال کی بات ہے ، مرحوم اجمیر شریف جا رہے تھے اتفاق وقت جس گاڑی سے مرحوم سفر کرنے والے تھے اُسی سے ایک بڑے ذی وجاہت بزرگ کا یونیورسٹی کی طرف سے خیر مقدم تھا ۔ اُن سے مولانا آزردہ تھے اُنھوں نے شاید یہ سمجھا کہ مولانا بھی ان کی پذیرائی کے لیے تشریف لا رہے ہیں دل میں خوش

ہو کر آگے بڑھے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مولانا نے بغیر کسی پس و پیش کے فرمایا "جی اس سعادت کے لیے دوسرے آئے ہوئے ہیں میں ہاتھ نہیں ملاتا" یہ کہہ کر اپنے ڈبہ میں سوار ہو گئے۔

آج تک کسی بڑے آدمی کی آمد پر یونیورسٹی کے کسی جلسہ میں شریک نہ ہوئے۔ کسی بڑے آدمی کے گھر نہ جاتے تاوقتیکہ اس سے یارانہ ہوتا مجھے معلوم ہے مرحوم کی ایسوں ایسوں سے بھی گہری دوستی تھی جن کو دین اور مذہب سے دور کا بھی سروکار نہیں اور ایسوں سے بھی تھی جو اپنے وقت کے بڑے مجتہد اور عالم دین سمجھے جاتے تھے۔ ہر شخص محبت و احترام کے جذبات سے کر آتا تھا۔ مطمئن و مسرور واپس جاتا۔ جس سے طبیعت نہ ملتی تھی کبھی اس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ مرحوم کی صحبتوں میں بیٹھ سکے مرحوم اس معاملہ میں بڑے سکھڑے تھے کبھی دنیا سازی کی خاطر کسی کی تالیف قلب نہ کی لیکن جن سے خاص تعلقات تھے اُن پر جان چھڑکتے تھے اس کی تکلیف سے مضطرب ہوتے اور اس کی خوشی سے باغ باغ ہو جاتے۔

مولانا کے خلاف اخباروں میں نامعقول مضامین نکلے اور اکثر ایسے ناروا اور رکیک حملے کئے گئے۔ کہ انھیں یاد کر کے میرا دل کڑھتا ہے اور لکھنے والوں سے مجھے قلبی نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ آج تک میں نے ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سنا جس سے اندازہ کیا جا سکتا کہ مولانا پر اس کا کوئی اثر ہے ایک دن معلوم نہیں کونسا

موقع تھا اس اختیاری گندگی کا تذکرہ آیا تو مرحوم نے فرمایا اور اپنے مخصوص قلندرانہ انداز سے چلو آگے بڑھو یہ نہیں دیکھتے کون کہہ رہا ہے صاحبزادہ ہو بھی دیکھنے ہو کس کے خلاف کہہ رہا ہے لڑائی مجھے پسند ہے لیکن بہادروں سے بیسواؤں سے نہیں۔

مرحوم کی شخصیت کا ایک عجیب کمال تھا جس کو میں محسوس تو کرتا ہوں لیکن وضاحت نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے مثال دینے سے یہ بات کسی قدر واضح ہو جائے۔

مرحوم کے دن رات کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں فرداً فرداً کوئی خاص جاذبیت نہ تھی لیکن یہی لوگ جب مرحوم کے حلقہ میں بیٹھے ہوتے تو یہ مجموعہ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا، اور ہر شخص فرداً فرداً نہایت دل پذیر۔ اور یہ بات کچھ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ مرحوم کے کمروں کے اندر جو چیز جہاں رکھی ہوتی اس میں بھی ایک خاص کشش نظر آتی۔

کم و بیش بیس سال سے مرحوم کے کمروں کے اندر کی تقریباً تمام چیزیں میری نظروں میں ہیں جو چیز جہاں آج ہے بیس سال پہلے دیکھی تھی۔ وہ آج تک موجود تھی۔ کرسیوں کی وہی ترتیب کتابوں کی الماری اسی جگہ پر تخت کی وہی جگہ۔ وہی پوشش۔ کھونٹیوں کا وہی مقام پاندان اسی کرسی پر چھوٹے چھوٹے بکس اور ٹوکریاں تخت کے پائے آتشدان پر کھڑی۔ بوتل، چائے کا ڈبا دو چار پیالیاں کھلی ہوئی شلجت پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابوں کا انبار تخت کے اوپر کھونٹیوں پر لٹکی ہوئی قیمتی کپڑوں کی شیروانیاں اور خوشنگ

صاف ایسا معلوم ہوتا جیسے مرحوم کی شخصیت کے یہ سب عناصر ترکیبی ہیں۔ اب اِدھر سے گزر ہوتا ہے اور دو منزلہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی اور دل بھر آتا ہے۔

میرا پہلا مکان دو منزلہ سے بہت قریب تھا، مردانے کے بیرونی دروازہ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب درختوں کی جھلملی میں دو منزلہ کا فرشی برآمدہ اور چبوترہ نظر آتا تھا، گھر میں کوئی زیادہ بیمار ہوتا اور طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی، کبھی کبھی دروازہ سے باہر نکلتا تو مرحوم اپنے چبوترہ پر لمبی کشادہ آستینوں کا ململ کا سپید کرتہ پہنے سر پر قیمتی مخمل کی گول ٹوپی پاؤں میں دِلّی کی نازک پُرزر جوتی پہنے، سر نیچے کئے ہوئے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرتے نظر آتے، دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی، سوچتا کہ مرحوم اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر گنگنا رہے ہوں گے، اگر چلا جاؤں تو وہ اُس طور سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت بحال ہو جائے گی۔ بس اتنا ہی احساس میری تسکین قلب کے لیے کافی ہوتا۔ میں مکان کے اندر آجاتا اور دُعا کرتا کہ خدا اطمینان دے تو مولانا کے ہاں جاؤں اور جی بھر کر اُن کی شفقت، مرحمت اور لطافت وظرافت سے جی سیر کروں۔

مرحوم کو میرے بڑے لڑکے اقبال سے بڑا اُنس تھا۔ حالانکہ ان کا تمام عمر خود اپنے کسی بچے سے سابقہ نہیں ہوا تھا وہ صرف چند مہینوں کا تھا کہ اسے بلا بھیجتے۔ گود میں بٹھاتے اس کا نام کدو رکھا تھا۔ پیشاب کر دیتا تو

کہتے ابے کدو تو نماز نہ پڑھنے دے گا۔ اچھا کوئی ہرج نہیں، کہ پیشاب بڑا ہوگا تو کہے گا مولانا ابا پر پیشاب کر چکا ہے۔ جب وہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تو اپنی دونوں ہاتھ کی انگلی اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور کہتے ناچ بے کدو ناچ۔ اس کے بعد اپنے مخصوص دل نشیں لیکن پُر وقار لحن میں کہتے:

"تُوم تُوم رے باجے تو مڑی تُوم تُوم رے بلبے تو مڑی، ہاں ناچ بے کدو ناچ۔"

سال ڈیڑھ سال کا تھا کہ ایک دن شام کو اقبال کو لے کر بھیکم پور چلے گئے بغیر ہم سب کو اطلاع کئے۔ دوسرے دن واپس آئے، بیحد خوش معلوم ہوا کہ بچے نے بالکل تنگ نہیں کیا۔ لیکن مرحوم تمام رات اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ انھوں نے بالکل اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ یکایک بغیر کہے سنے کیوں اقبال کو بھیکم پور لے کر چلے گئے۔ ایک دن اسی زمانہ میں بچہ کو دیکھ کر کہنے لگے کدو تیرا باپ تجھے کپڑے نہیں پہناتا اچھا دیکھ تیرے لیے میں کپڑے بناؤں گا۔ چند ہی دنوں بعد میں دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی پُر تکلف اچکن پہنائے ہوئے حسب معمول اسے نچا رہے ہیں۔

حج کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں سے اقبال کے لیے ایک نہایت خوب صورت جھنجھنا اور عقال لائے۔ اقبال رات میں روتا تو صبح کے وقت مولانا کا آدمی ضرور آتا کہ رات کو کدو کیوں رویا، اسے بھیج دو اقبال بڑا ہوا تو اکثر کھانے پینے کی چیزیں خود لے کر جاتا۔ مرحوم بہت

خوش ہوتے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں، میوے، پھل ہمیشہ بھیجتے رہتے اور کہلا بھیجتے کہ یہ کدو کے لیے ہے۔ وفات سے سال سوا سال پہلے صحت اچھی نہیں رہی تھی۔ اقبال کچھ لے جاتا تو کہتے لے کدو اب میں بیمار ہوں اور بڈھا ہو گیا۔ اب تیری لائی ہوئی چیز کیسے کھاؤں۔

اکثر کہا کرتے اقبال کو میرے ہاں بھیج دیا کرو میں اسے عربی فارسی پڑھاؤں گا۔ اب کدو بڑا ہو گیا۔ اب نہیں تلپے گا اس لیے اب اسے دوسرا ناچ نچاؤں گا۔ اقبال کچھ دنوں تک بہت بیمار رہا میں پریشان رہنے لگا۔ مرحوم نے سنا تو فرمانے لگے! ارے کدو کا جگر خراب ہے۔ گھبراؤ نہیں کوئی بات نہیں، ڈاکٹروں کی بات میں نہ آؤ۔ یہ کتابی باتیں کرتے ہیں مریض کو نہیں پہچانتے۔ پہاڑ لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ، فائدہ ہو گا لیکن کدو سے کہہ دو ناچتا رہے۔ تُوم تُوم سُہے بلتے تو مرٹی!

میرے مضامین کے بڑے شائق تھے، خود پڑھتے اور اپنے مخصوص اور بے تکلف دوستوں کو سناتے، میں ملتا تو مضمون کے بارہ میں اپنی رائے بھی سنا دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ کن کن کو انھوں نے مضمون سنایا اور کس کس نے کیا کہا لیکن اکثر اس کے خلاف بھی ہوتا۔ ایک دن یونیورسٹی آفس سے اتر کر اسٹریچی ہال کی طرف آ رہے تھے، میں سڑک سے گزر رہا تھا۔ سلام کیا، بولے :- اجی یہ تم کیا مہمل لکھنے لگے ہو! اس دفعہ کا مضمون بڑا لغو تھا، ہاں بالکل بے سر و پا۔ اچھا جاؤ اپنا کام دیکھو، میں نے چاہا

کچھ کہوں، کہنے لگے :- بس بس آج اتنا ہی وہ دیکھو تمھارا یار آرہا ہے جاؤ -!

مرحوم کی سیرت کا ایک خصوصی پہلو یہ تھا - وہ جو چیز رکھتے تھے اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی اور بہت دلکش ہوتی، بڑی قیمتی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہوتی، ہمیشہ پاکیزہ قیمتی اور مردانہ وضع کے لباس پہنتے، گراں قیمت اور نادر قسم کے اونی کپڑوں کا بہت شوق تھا، شیروانی یا روئی دار اچکن کا کپڑا بڑا صوفیانہ اور دلکش ہوتا - ایک دفعہ افغانستان سے ایک گرم عبا منگائی تھی فاختئی رنگ کا کپڑا، جس پر ابھرے ہوئے ریشمی ریشمی پھول کاڑھے گئے تھے - ایک دن میں پہنچا تو بولے خوب آئے - گچن وہ عبا تو لانا، یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی کے پاس کیسے کیسے مالِ غنیمت ہیں - عبا لائی گئی بڑے شوق سے پہنا، بولے کیا رائے ہے، میں بہت قریب پہنچکر دیکھنے لگا - اس پر ہاتھ پھیرا اور ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرنے لگا - بولے خیریت تو ہے اس قدر انہماک کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے؟ میں نے عرض کیا :- کیا کہوں اسی طرح کی ایک چیز اس دن جلسہ میں نواب مزمل اللہ خاں کو پہنے دیکھا تھا - اُن کے قریب تو جانے کی ہمت نہ ہوئی - آج آپ کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے اس تخت طاؤس کو ذرا چھو چھا بھی لوں - بڑے زور سے ہنسے کہنے لگے : باز نہ آؤ گے، اچھا ایک پان بناؤ اور یہ تو بتاؤ وہ تمھارا یار ذاکر کہاں ہے بڑا مرد آدمی ہے - ذرا

صحت اچھی نہیں ہے، میں نے کہا۔ جی ہاں ان دنوں صحت اچھی نہیں ہے بولے یہ کیا۔ میں کہتا ہوں اس کا ساتھ نامعقولوں سے پڑا ہے تم کہتے ہو صحت اچھی نہیں پھر آواز دی جمّا ذرا ایک طشتری میں رشید کے لیے پنڈی تو لانا۔

مرحوم کے معمولات بھی غیر معمولی تھے۔ سردیوں میں باہر سوتے تھے، ابتدا میں تو بالکل صحن میں لیکن ادھر چند سال سے برآمدہ میں آرام کرنے لگے تھے۔ گرمیوں میں اندر رضائی اوڑھ کر، بستر گداز، چادریں ستھری، تکیے متعدد۔ پنکھے کا کوئی دستور نہ تھا۔ گرمی میں نہ برف کا پانی مل سکتا تھا نہ سردی میں گرم پانی ہمیشہ کہتے تھے کہ پسینہ آنا بہت اچھا ہے شام کا نہانا اور دھوپ میں بیٹھنا منع کرتے تھے۔ دوسرے کے تولیے یا رومال سے ہاتھ نہیں پونچھتے تھے ننگے سر مشکل دیکھے جاتے تھے، گفتگو بلند آواز سے کرتے، کانا پھوسی گوارا نہ تھی۔ عمامہ اکثر ہلکے زعفرانی رنگ کا ہوتا اور جوتی دِلّی کی پُر زر۔ ململ کا لمبا بڑی کشادہ آستینوں کا کرتہ پہنتے جس کے نیچے ہمیشہ ململ کی بٹن دار صدری ہوتی۔ کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور وضع کا ہوتا۔ کسی کو اچھا کپڑا پہنے دیکھتے تو خوش ہوتے اور تعریف کرتے ناپسند ہوتا تو کہہ بیٹھتے۔ سالن بہت تیز مرچوں کا پسند تھا۔ ہمیشہ چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کھاتے، نوکروں کا بڑا پاس رکھتے۔ لکھنے میں سطر کبھی نہیں سیدھی ہوتی تھی جیسے دوست رکھتے اُس سے نہایت خوش ہو کر آگے بڑھ کر جی کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش طبعی یا خوش دلی کا نعرہ ضرور

کہتے ۔ مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے نہ کسی کے اقتدار سے ۔ مذہبی عقائد میں کٹر، سلوک میں بے لوث، جو جتنا چھوٹا ہوتا اُس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے ۔ بڑا ہوتا تو اُس سے کہیں اور بڑا ہو کر ملتے، علم کا وقار ان کے دم سے تھا ۔ معزز و محبوب مولوی میں نے ان ہی کو پایا ۔

قد میانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا پتلے، نقشہ نرم و نازک آنکھیں چھوٹی جن میں جذبات کا اُتار چڑھاؤ جھلکتا رہتا ۔ نظر تیز و بڑا اعتماد انداز میں بانکپن، انگلیاں ایسی جن میں قلم شمشیر و رباب سب ہی زیب دیں، آواز میں کڑک اور لچک، دھمک بھی، خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ دیں گے، نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہنچاتے ہیں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہے ۔

جمعہ کی ایک نماز یاد ہے، جاڑے کے دن تھے ۔ یخ بھری ہوائیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رگ و ریشہ میں سوئیاں بن بن کر اُترتی جاتی ہیں ۔ ناظم صاحب دینیات غالباً موجود نہ تھے ۔ مرحوم امامت کے لیے آگے بڑھے تکبیر بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولانا نے کہا اللہ اکبر ایسا معلوم ہوا جیسے اس صدا نے فضا کی ہر صدا کی لرزش چھین لی ۔ اس کے بعد جو قرأت شروع کی ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے خالد کی تلوار میدان جہاد میں کوندتی، لرزتی گرتی، لچکتی، کاٹتی، سمٹتی، تیرتی، اُبھرتی، آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے ۔
کوئی لمبی سورت تھی جب تک ختم نہیں ہوئی یہ معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے

جسم وجان میں بجلیاں پھر گئی ہیں - اور شوقِ خود سپاری میں ہمیں نہیں
درود دیوار بھی جھوم رہے ہیں اُس دن کی نماز اب بھی یاد ہے اور ہاں
اس پر ایمان بھی ہے کہ وقت آ گیا تو شوقِ شہادت دُنیا کے ہر نشیب و
فراز اور زندگی کے ہر تامل و تذبذب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے
جائے گا !!

مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارہ میں ان کو یقین
ہوتا کہ اس کو علم کا گھمنڈ ہے یا علم کی گہرائی یا وزن نصیب نہیں ہے یا صرف
دنیوی اقتدار کا حامل ہے - اگر کوئی چھیڑ بھی دیتا تو ٹال جاتے ورنہ صاف
کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجئے آپ کو ان باتوں سے کیا
سروکار !

المبین شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ سر اقبال مرحوم کو بھی بھیجا تھا
اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلہ میں علی گڑھ
تشریف لائے - کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہو گئیں - المبین کا
ذکر چھڑ گیا - سر اقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولانا آپ نے
عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے - جن کی طرف پہلے
کبھی میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا - گفتگو ہوتے ہوتے ایک موقع ایسا آیا
جب سر اقبال مرحوم نے فرمایا کہ "مولانا دوسرے اڈیشن میں اگر اس بحث
کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہوگا " ایک ذی وجاہت بزرگ
جن کو یونیورسٹی کے نظم و نسق میں کافی عمل دخل تھا اور اپنے سن وسال

اور قومی خدمات کے اعتبار سے بھی علی گڑھ کی دنیا میں بہت کچھ اہمیت حاصل تھی، مرحوم سے ذرا فاصلہ پر دستر خوان پر موجود تھے وہیں سے آواز دی "ہاں مولانا میری بھی وہی رائے ہے جو سر اقبال نے دی ہے، دوسرے ایڈیشن میں ......" اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ مرحوم نے للکارا "...... صاحب بس کیجئے، آپ کھانا کھائیے آپ کو ان باتوں سے کیا نسبت، ان باتوں میں نہ پڑیئے کھانا کھائیے ملاحظہ فرمایا نا۔ ہاں بس کھانا کھائے جائیے!"

ایک اور بزرگ جن کے بارہ میں کچھ نہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ دینیات کے نصاب سے دل چسپی لینے لگے۔ کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ مرحوم تبادلۂ خیالات سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے۔ مرحوم نے تحریری کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک صاحب سے یہ البتہ کہلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں۔ انھوں نے اسی کو غنیمت سمجھا ایک دن حلقۂ چائے نوشی میں آکر شریک ہوئے اور تھیالوجی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا آپ کو دینیات سے کیا واسطہ آپ کے اپنے مشاغل کیا کم ہیں کہ دینیات کی طرف توجہ فرمائیں۔ وہ صاحب خفیف ہو کر خاموش ہو گئے تھوڑی ہی دیر میں آموں کا تذکرہ آگیا اس میں نو وارد نے بڑے انہماک سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ مرحوم نے فرمایا "یہ ٹھیک ہے اس پر گفتگو کیجئے ملاحظہ فرماتے ہو نا یہ آپ کا حق ہے۔"

کچھ دنوں کی بات ہے کہ مرحوم کے ہاں ایک بڑے سن رسیدہ بڑے بزرگ اور بڑے جیّد عالم ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپس میں بے تکلفی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے خانقاہ میں کون بار پا سکتا تھا۔ چلّے کی سردی تھی۔ مرحوم حسبِ معمول برآمدے میں سوئے ہوئے تھے اور مہمان کمرے کے اندر۔ مہمان تہجّد کی نماز پڑھنے اُٹھے دروازہ کھولنے پر مرحوم کی آنکھ کھل گئی پوچھا کون جواب ملا کوئی نہیں میں ہوں۔ بولے خیر تو ہے کہا وضو کروں گا بولے تو کیجئے نا کسی کی نیند کیوں حرام کرتے ہیں انھوں نے دبی زبان سے کہا تھوڑا گرم پانی مل جاتا۔ فرمایا جہنّم میں۔ مہمان نے کہا۔ مکرّر ارشاد ہو پورے طور پر سن نہ پایا۔ بولے گرم پانی جہنّم میں ملے گا۔ انھوں نے جواب دیا تو اٹھو راہ بتاؤ۔ مرحوم نے قہقہہ لگایا بولے نیند تو غارت کی لیکن فقرہ خوب کہا۔

ایک دن کلاس پہنچے خلافِ معمول بہت کم لڑکے نظر آئے پوچھا کیا بات ہے باہر سے کوئی مشہور کرکٹ ٹیم آئی ہوئی ہے بڑے معرکہ کا میچ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکے نے کہا مولانا چھٹی دے دیجئے بولے ہاں چھٹی ہے مقصود حاضری تھی۔ لڑکے نے جواب دیا مولانا حاضری لگائیے گا تو بہتوں کا نقصان ہو جائے گا۔ فرمایا حاضری اپنی مقصود تھی تمھاری نہیں۔ جاؤ جاؤ تم بھی میچ دیکھ آؤ۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ میں کلاس میں لوائح جامی اور گلشن راز پڑھایا کرتا تھا۔ ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے کبھی کبھی اپنی

دقتیں لیکر مرحوم کے پاس پہنچ جاتا۔ بہت خوش ہوتے کہتے بیٹھو، میں کہتا مولانا کلاس شروع ہونے والی ہے۔ صرف چند مقامات ہیں جہاں اٹکتا ہوں فرمایا یہی تو مصیبت ہے۔ تفصیل سے باتیں نہیں سنتے تھوڑا سا پا لیا اور بھاگ نکلے طالب علم یہ نہیں کرتے، یہ کام اٹھائی گیروں کا ہے پگڑیاں ہوں یا ڈگریاں سب اٹھائی گیرے علم کی عظمت باقی نہیں رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آئے۔ میں نے کہا مولانا گھنٹہ ہونے والا ہے۔ آخر اٹھائی گیروں پر بھی تو بڑا وقت آتا ہے۔ کہتے اچھا اچھا بولو، پڑھو، میں پڑھنا شروع کرتا۔ بیچ ہی میں روک دیتے کہتے معلوم ہے پھر اس کی وضاحت کر دیتے اور چلنے لگتا تو کہتے دیکھو پھر کہتا ہوں۔ قرآن پڑھ ڈالو۔ لوائح جامی اور گلشن راز کلاس میں پڑھا دوگے لیکن قرآن پڑھے بغیر لکھے پڑھے لوگوں کے مجمع میں ان مباحث کو مت چھیڑنا آگے تم جانو تمھارا کام اور ہاں ایک پان کھاتے جاؤ۔ میں نے کہا جی نہیں کلاس بھاگ جائے گی کہتے ٹھہرو ٹھہرو، پڑھانا آتا ہے تو کلاس بھاگ جائے تو بھاگ جائے پڑھنے والے انتظار کرتے رہیں گے پان تو کھاتے ہی جاؤ۔!

ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے ایک صاحب تھے جن کو خانقاہ سلیمانیہ میں لائف ممبری کا درجہ حاصل نہ تھا لیکن اکثر بار پا جاتے تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے علم و فضل کا تذکرہ تھا کہ متذکرہ صدر بزرگ بھی آپہنچے۔ یہ مولانا لطف اللہ

صاحب مرحوم کے شاگرد تھے۔ چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تعریف و توصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چلنے کا ایک دہکتا دہکتا نیم جرعہ لیتے ہوئے فرمایا بھائی میں تو مولانا لطف اللہ صاحب کی کرامت کا قائل ہوں۔ نو وارد نے تعجب میں آ کر پوچھا، مولانا یہ کیونکر، مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "اور جو انھوں نے آپ کو پڑھا دیا یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے!"

کئی سال ہوئے ایک رات گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زنانی سواریاں آئی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا چلو مولانا کے ہاں ہو آؤں، پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کلاسیکل چھوٹی گول میز کے سامنے اپنی کرسی پر پاؤں اٹھائے اکڑوں بیٹھے ہوئے کوئی چیز بڑے غور سے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا مخل تو نہیں ہوا۔ بولے بیٹھ جاؤ، ابھی بتاتا ہوں۔ میں بیٹھ گیا۔ عینک کے اوپر سے نگاہ کر کے بولے ٹھکانے سے بیٹھو، گپ ہو گی، تھوڑی ہی دیر میں پرچہ علیحدہ رکھ دیا۔ عینک کو اس کے خانہ میں رکھا پھر بولے سنو ؎

ادھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

بے نظیر شاہ کو جانتے ہو نہ، میں نے کہا جی، شاہ صاحب کو کون نہیں جانتا۔ کہنے لگے اور سنو ؎

ازل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

بولے یہ شخص چھوٹی بحر میں کہنے کا بادشاہ ہے، میں نے کہا درست بادشاہوں کا کیا کہنا، بے اختیار ہو کر فرمایا :- وہ بھی ٹھیک کہتے ہو- ہاں ہاں ہم سمجھے بادشاہوں کا کیا کہنا -

میں نے کہا تو کیا اسی کا مطالعہ ہو رہا تھا- فرمایا نہیں یہ نہیں، ایک اشتہار تھا میں اشتہارات اکثر پڑھ لیا کرتا ہوں اس سے تمہاری قوم کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے - یہ دوا کا اشتہار تھا- دنیا میں اور امراض کی دواؤں کا بھی اشتہار دیا جاتا ہے -ہندوستان میں صرف ایک ہی مرض ہے، جدھر دیکھو اسی کا چرچا جس طرف دیکھو قوتِ مردمی کا ماتم، جہاں دیکھو مایوس العلاج، اس سے اندازہ کرو کہ ہمارے کیا کرتوت ہیں کیا خیالات ہیں اور ہم کدھر جا رہے ہیں اور پھر یہ بھی تو دیکھو تمہاری اُردو کہاں جا رہی ہے۔ شروع سے آخر تک یہی اشتہارات یہی امراض- میں نے کہا جی ہاں، فرمایا، اچھا اچھا، کھانا کھا لیا ہے ؟ میں نے کہا جی نہیں کہنے لگے یہ بھی اچھا ہوا- میں کھا لوں تو گپ ہوگی، تمہیں نہیں کھلاؤں گا آج کل صرف ایک پھلکا اور کدو گوشت کا سیٹھا پھیکا شوربا ہوتا ہے بھوک لگی ہے ؟ میں نے کہا جی ہاں وہ تو قائم سی ہو گئی ہے، ہنسے آواز دی جما ! نکتیوں کے لڈو لاؤ -

لڈو آئے تو بولے کھالو- منیر کے ہیں منیر کے- منیر کا نام سنا ہے میں نے کہا جی ہاں خط و کتابت بھی رہی ہے، بولے ہائیں یہ کیا ؟ میں نے کہا وہی برادرم شمس الدین و زین الدین، ہنسے فرمایا خوب یاد رکھا اور ہاں

ایک کدو کے پیسے لیتے جانا۔ کدو اب بڑا ہو گیا۔ ہاکی کھیلتا ہے خوب ناچتا تھا۔ کدو کہیں کا!

کھانے سے فارغ ہوئے۔ حسبِ معمول صراحی سے براہِ راست حلق میں پانی انڈیل کر پیا۔ ہاتھ دھوئے اور اپنے سرخ ملیے چوڑے رومال سے ہاتھ منہ پونچھتے باہر نکل کر چبوترے پر مونڈھے پر بیٹھ گئے تھوڑی دیر تک خلال کرتے رہے۔ میں نے پان بنا کر دیا اسے کر منہ میں رکھا۔ مونڈھے سے ذرا ایک طرف مائل ہو کر پہلی پیک براہِ راست پیتل کے چمک دار اُگال دان میں ڈالی جو ٹھیک سوراخ میں جا گری، اور اُگال دان کے حاشیہ پر چھینٹ تک نہیں آئی۔ مرحوم اسی طرح اپنی اونچی کرسی پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے نیچے اُگالدان میں پیک ڈالتے تھے۔ اور کہیں اِدھر اُدھر اُگال دان پر چھینٹ نہ پڑتی تھی۔

قمری مہینہ کا شاید یہ تیسرا ہفتہ تھا۔ اکتوبر کا مہینہ، رات کسی قدر بھیگنے لگی تھی۔ چاند اُفق سے کچھ ہی بلند ہوا تھا۔ لیکن اس کا مدھم نمناک اُجالا درختوں کی پھنگیوں اور عمارات کے کنگروں پر نمایاں ہو چکا تھا بولے کل رات میری طبیعت گھبرائی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ بالآخر دل میں آیا کہ مردوں سے گفتگو کروں، کہو کیا سمجھے، میں نے کہا بالکل نہیں سمجھا، کہا ہاں مردوں سے پھر اس کی وضاحت کی فرمایا۔ میں نے وہ پلندہ نکالا جس میں ۲۵، ۳۰ برس کے خطوط رکھے ہیں۔ عزیزوں دوستوں میں سے جو وفات پا چکے ہیں ان کے خطوط، وہ خطوط جو انھوں نے زندگی

میں رکھے تھے ان سب کو نکالا۔ بعض بالکل شکستہ تھے بعض کی سوادِ تحریر بے نور ہو چکی تھی بعض اس طرح لفافوں میں رکھے ملے جیسے ان کو میں نے کھولا ہی نہیں تھا۔ مہریں تک پھیکی پڑ گئی ہیں۔ انھیں میں نے بڑی احتیاط سے کھولا۔ ڈر کر محبت سے کبھی بے اعتنا رہ کر کبھی مسرور ہو کر کبھی جھجک کر کھولا، ان سے باتیں کیں وہ زمانہ یاد آ گیا جب زندگی عبادت تھی ان کے خلوص سے ان کے جھگڑوں سے ان کی فرمائشات سے کسی میں کسی کے آنے کا مژدہ تھا۔ کسی نے بلایا تھا۔ کسی نے مجھے پریشانی میں تسکین دی تھی۔ پھر میں بالکل بھول گیا کہ یہ لوگ مر چکے ہیں مجھے یقین ہو گیا کہ سب زندہ ہیں۔ میں ہی مر چکا ہوں۔

پھر بولے، اور نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے تم تو جانتے ہو بھائی صاحب مرحوم پورے پاگل تھے۔ میں نصف پاگل ہوں کبھی کبھی پورا پاگل ہو جاتا ہوں۔ اس وقت ناواقف مجھ سے آزردہ ہو جاتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔

ہاں تو عجیب عجیب خطوط ملے۔ پاگل کا ذہن تم کو معلوم ہے کبھی کبھی ایسا سریع السیر، ایسا شفاف اور ایسا رنگین ہو جاتا ہے کہ بس ...... اس کا احساس صرف پاگل ہی کو ہو سکتا ہے۔ تم کو ہوتا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں لیکن ہو کر رہے گا۔ خوش ہو گئے، کہا ایک پان اور بناؤ، میں ذرا پانی پی لوں۔ پان کھا کر اور پانی پی کر تھوڑا ٹہلے، پھر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے یہ ذہن اور اس کے تصورات عجیب ہیں۔ پاگل کی ذہنی

سطح ذی حواس کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہوتی ہے۔ بہت واضح اور نہایت
بامعنی۔ وہ تمہاری عقل اور تمہارے اکتسابات شعوری و غیر شعوری سے
آزاد ہوتا ہے اس کے تصورات زیادہ مخلصانہ ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت
پا لیتا ہے۔ نتیجے نہیں استنباط کرتا اس کو نتیجہ استنباط کرنے کی ضرورت
ہی نہیں ہوتی۔

ہاں تو...... کا خط دیکھ رہا تھا معلوم ہوتا تھا سامنے موجود ہے میں
نے اسے چھوا۔ میرا گھر بنوا رہا تھا۔ محبت سے محنت سے۔ یہاں دوڑ کر
جاتا ہے۔ وہاں سے آواز دے رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے رُک
گئے۔ پھر بولے...... کو جانتے ہو؟ میں نے کہا پورے طور پر یاد
نہیں کہنے لگے وہ بھی موجود تھے۔ جوں کا توں لفافہ میں بند پھر رُک کے
کہنے لگے سب موجود ہیں خوب بات کرتے ہیں ہنستے ہیں۔ اب قبرستان
میں سوتے ہیں لیکن میرے ہاں ہنستے بولتے ہیں۔ سبھوں کو بند کر رکھا
ہے......"

اتنے میں ایک تانگہ آیا۔ ایک صاحب نے اُتر کر کسی کا پتہ دریافت
کیا۔ معلوم ہوا جیسے مرحوم کے اردگرد تصورات کی کچھ مرئی کچھ غیر مرئی
بھول بھلیاں قائم ہو گئی تھی وہ یک بیک فضا میں تحلیل ہو گئی۔ بولے
بھائی آگے جاؤ یہاں کوئی نہیں، میں نے کہا رات زیادہ آئی اب گھر
جاؤں گا۔ کہا جاؤ۔

عرصہ کی بات ہے ایک دن خود بخود فرمانے لگے ہم اس مغالطہ میں

مبتلا تھے۔ کہ ہم جیسا خبطی شاید ہی کہیں ملے۔ لیکن ایک ہم سے بھی زیادہ بگڑے دل نکلے۔ صبح کمرے میں سو رہا تھا۔ حسب معمول رضائی اوڑھ کر اور کمرہ بند کر کے ایک صاحب نشست کے کمرے میں آئے دیکھا کوئی نہیں ہے سونے کے کمرہ پر آ کر دستک دی اور سلام علیک کچھ اس انداز و لہجہ سے کہا کہ میں چونک پڑا۔ رضائی کے اندر ہی سے جواب دیا علیکم السلام انھوں نے فرمایا، مزاج شریف، میں نے کہا ابھی آنکھ لگی تھی فرمایا مولانا میں نے آپ کے ملاحظہ کے لیے ایک کتاب بھیجی تھی جواب میں عرض کیا گیا، بھیجی ہو گی۔ آتی ہی رہتی ہیں۔ بولے آپ نے مطالعہ کیا؟ میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ مطالعہ کی جائے۔ یہ سب کچھ وہ کھڑے فرما رہے تھے اور میں رضائی کے اندر ہی سے جواب دے رہا تھا۔ اتنے میں آواز آئی۔ مولانا آپ کی دو باتوں کی شہرت سنی تھی ایک اخلاق کی اور دوسرے علم کی۔ اخلاق کا تو حال معلوم ہو گیا۔ علم کی بھی کسی دن تصدیق ہو جائے گی۔ سلام علیکم! میں گڑبڑا کر چارپائی سے اٹھا اور جلدی جلدی نشست کے کمرہ میں آیا لیکن وہ جا چکے تھے۔

مرحوم دوست بنانے اور معالج انتخاب کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے ایک دفعہ کہنے لگے سوچی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا معالج سے فائدہ ہوتا ہے جب تک معالج ٹکر کا نہ ہو مریض کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک قصہ سنایا کہنے لگے ایک دفعہ خیال آیا کہ

دلی کے کسی اصلی حکیم سے رجوع کروں ۔ چنانچہ بہت غور و فکر اور تلاش کے
کے بعد ایک ایسے طبیب کا انتخاب کیا گیا جو طب میں دہلی کے بعض مشہور
اطبا کے استاد رہ چکے تھے ۔ اسّی پچاسی سال کا سن بڑے متدیّن پرہیز گار
اور صاحب کمال تھے ۔ ان کے خیالات بھی عجیب و غریب تھے یہ ناممکن
تھا کہ ان کے مطب میں کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھ کر چلا جائے ایک صاحب
سوٹ پہن کر آ گئے تھے تو ایسے بپھرے کہ سارا مطب زیر و زبر ہونے لگا
اور جب تک وہ چلے نہیں گئے چین سے نہیں بیٹھے کہتے تھے دیکھو
تو جہاں میں نماز پڑھتا ہوں وہاں یہ مسخرہ ترکی ٹوپی اور کوٹ پتلون پہن
کر چلا آیا ۔ مرحوم نے ان سے ملاقات کی ، بڑے تپاک سے ملے مرحوم نے
اپنی شکایات بیان کیں ۔ بھوک نہیں لگتی ۔ قبض رہتا ہے ، تبخیر کی شکایت
ہے ، خیالات منتشر اور پراگندہ رہتے ہیں ۔ اختلاج کی تکلیف ہو جاتی
ہے ، کبھی کبھی خفقانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ نیند بہت کم آتی ہے
وغیرہ ۔

حکیم صاحب سب کچھ بہت غور سے سنتے رہے اور اکثر سر اس طور
پر ہلا دیتے گویا ہر بات دل نشین ہوتی جا رہی ہے ۔ جب مرحوم کہنا ختم
کر چکے تو حکیم صاحب بولے ٹھیک ہے ، بالکل بجا فرمایا ، ایسا ہی ہوتا ہے ،
ایسا ہونا چاہیئے ۔ مرحوم نے فرمایا کوئی نسخہ تجویز فرما دیجیئے تو بولے ،
جی نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے ، شرفا کا مرض ہے ، شریفوں کو یہی شکایات
لاحق ہوتی ہیں ، مرحوم نے فرمایا آخر کوئی علاج ، بولے بالکل نہیں ، کوئی

مرض ہو تو علاج کیا جائے۔ اشراف انہی شکایات میں مبتلا ہوتے ہیں !

میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا کالج کھلنے والا تھا۔ مرحوم وطن سے تشریف لا رہے تھے، میں الہ آباد میں ملا، مرحوم سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے اور مرحوم کے بڑے بھائی جو عرصہ سے اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے ہمراہ تھے، اسٹیشن پر مجھے دیکھا، بولے آجاؤ، کھانا کھایا جائے گا۔ میں نے کہا میں سیکنڈ کلاس میں کیسے بیٹھوں کہنے لگے کھانا کھانے کے لیے ہر کلاس برابر ہے کوئی پوچھے گا تو میں سمجھ لوں گا، تم تو آ ہی جاؤ۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبہ میں تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا اور جو یہ "فورث ولیم" بیٹھا ہوا ہے، کہنے لگے گھبراؤ نہیں بار رہے آجاؤ۔ میں اندر آ گیا انگریز نے مولانا کی طرف اس طرح دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مولانا کی تجویز سے اتفاق کرتا ہے۔ مولانا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ہاں بیٹھے رہو۔ سب ٹھیک ہے سمجھے نا کھانا کھائے گا ؟ اس نے اشارہ سے ظاہر کیا گویا وہ ہر طرح راضی و خوشنود کھانے سے البتہ معذور ہے۔

نصف ڈبہ میں مولانا کا سامان رکھا ہوا تھا، ہر طرح کے بکس بستر، ٹوکریاں، ڈبے، گٹھریاں، صراحی، پاندان۔ کھانے کا سامان نکالا گیا، ایک پوری برتھ کھانوں سے بھر گئی، ہر طرح کے کھانے ہر ذائقہ کے حلوے، مٹھائیاں ان کے علاوہ، کہنے لگے یہ کھاؤ ہماری طرف کی خاص چیز ہے، انیب کی کونپل اور کلیاں قیمہ کے ساتھ پکائی گئی تھیں بڑی

تیز مرچیں ڈالی گئی تھیں ۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی تھی ۔ دوسرا سالن خالص ہری مرچوں کا تھا ۔ پراٹھے ، خستہ ٹکیاں اور پوریاں علیحدہ تھیں ۔ بڑے مزے سے کھانا کھایا گیا ۔ کہنے لگے خوب کھاؤ والدہ نے پکایا ہے یہ نعمت کہاں ملتی ہے ، سمجھتے ہو ، ماں نے پکایا ہے ۔ہاں وہ یہ خیال کرکے کیسی خوش ہوتی ہوں گی کہ سلیمان کھا رہا ہے ۔کھلا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے ۔

مرحوم کے بڑے بھائی جو سفر حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے کھانے میں شریک ہوتے ۔کیسی ہی پُر تکلف دعوت یا معزز مہمان کیوں نہ ہوتے ۔ یہ ہمیشہ شریک رہتے تھے ۔ مرحوم اُن کو "بھائی جان" کہتے تھے ۔ بھائی جان بولتے بالکل نہ تھے ، دسترخوان پر یک بیک آجاتے اور جو کچھ جی میں آتا اور جس طرح جی میں آتا کھاتے اور فوراً اُٹھ کر چل دیتے ۔ بھائی جان کی طرف دیکھ کر کہتے :۔کیوں بھائی جان ٹھیک ہے نا ۔ وہ حسب معمول جواب نہ دیتے ۔ ماں کا نام اور غالباً مرحوم کی جوش اور محبت بھری باتیں سن کر پہلو بدل لیتے اور جلدی جلدی ہر چیز میں ہاتھ ڈالتے کچھ ٹٹولتے اور تھوڑا بہت اُٹھاکر منہ میں رکھ لیتے ۔

اسی زمانہ میں میری والدہ مرحومہ نے رحلت فرمائی تھی مرحوم نے ماں کی باتیں کچھ ایسی وارفتگی سے بیان کرنا شروع کی تھیں کہ میری طبیعت بھر آئی مرحوم نے دیکھا اور بغیر کسی ارادہ یا تکلف یا قطع کلام کئے ہوئے یا کھانے کی طرف سے توجہ ہٹائے ہمسے کہا :۔ہاں ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے

لیکن ہو نہ چکا، خیال فرماتے ہو بس ہو چکا، بڑی خوش نصیب تھیں کہ تمہارے سامنے مریں، تم ان کے سامنے نہ مرے ان کو یاد رکھو، ہمیشہ یاد رکھو، ماں کو کون بھولتا ہے۔ جب تک نہ بھولو گے لڑکپن کی خوش دلی اور حوصلہ باقی رہے گا۔ یہ لو پانی پیو۔ سب کچھ ماں کا دیا ہوا ہے اور ہاں یہ لینا۔ یہ آم ..... کے باپ نے دیا تھا۔ کہتا ہے اس کے باغ کے درخت کا پہلا پھل ہے۔ جب تک میں نہ چکھ لوں گا کسی اور کو نہ ملے گا۔ اس میں تمہارا بھی حق پہنچتا ہے۔ یہ ہمارے بہار کا آم ہے۔

اتنے میں فتح پور آ گیا، کہنے لگے جاؤ، اٹاوہ پر پھر ملنا چائے پی جائے گی۔

مرحوم ہمیشہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ بڑے سامان و اہتمام کے ساتھ۔ سیٹ ہمیشہ ریزرو کرا لیتے تھے۔ مرحوم اس زمانہ سے سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے جب سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا خاص منزلت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس سامان و اہتمام کے ساتھ آج کل میں نے اچھے اچھوں کو بھی فرسٹ کلاس یا سیلون میں سفر کرتے نہیں پایا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی صاحب وقار سفر کر رہا ہے۔ آسائش کی ہر چیز بڑھیا اور ستھری، ہم سفروں کا رکھ رکھاؤ، لباس و اطوار میں صفائی اور خوش سلیقگی۔ جس غرض سے سفر کرتے تھے صرف اس کو پورا کر کے واپس آ جاتے تھے۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ جس خاص غرض سے سفر کیا ہو اس کے علاوہ بھی کچھ اور کر کے واپس آئے ہوں۔

کچھ ہی دن ہوئے ۔ رات کا وقت تھا، باہر چبوترہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے ۔ آج تم سے ایک بات پوچھتا ہوں ۔ یہ تو بتاؤ دل میں کبھی کوئی خطرہ بھی گزرتا ہے میں نے کہا میں نے آپ کے سوال کی نوعیت کو نہ سمجھا خطرہ سے کیا مراد ہے کہنے لگے مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہم سے یہ اچھا کام نہ ہو سکا حالانکہ ہم ایسا کر سکتے تھے ۔ میں نے عرض کیا ۔ آپ تو جانتے ہیں میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن رہا ہوں ۔ مجھے ہمیشہ ہر وہ نعمت حاصل رہی جس کی میں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہے جو اکثر مجھے کھٹکتی ہے ۔ کہنے لگے، ہاں ہاں وہی بات تو پوچھتا ہوں ۔

میں نے کہا آج علی گڑھ آئے ہوئے ۲۳، ۲۴ سال ہوئے گھر سے پہلے پہل نکلا تو زندگی کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی کا تھا ۔ اب خدا کے فضل سے ہر طرح کی کامرانی اور فراوانی حاصل ہے یہ بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں ہے ۔ کہ ماں باپ بھائی بہن جو آج سے ۲۳، ۲۴ سال پہلے موجود تھے سوا والدہ مرحومہ کے سب بقیدِ حیات ہیں ۔ اور میری کامرانی سے خوش اور مطمئن لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی، یہاں کی ہما ہمی، بیوی بچے، دوست احباب وطن سے دوری اور اس قسم کی بہت سی باتوں نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ ان لوگوں کا دھیان بھی آتا جو میری دولت، راحت اور شہرت میں شریک ہونے کا حق رکھتے تھے ۔ مجھ پر بہنوں کے حقوق ہیں ان حقوق کو

میں تھوڑا بہت ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہیئے اور جتنا کرنا چاہیئے۔ اس سے اغماض کرتا ہوں بہنیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں۔ بھائی بھی برسرِکار ہیں ان میں کوئی آرام سے بسر کر رہا ہے اور کوئی تنگی ترشی سے، والد صاحب گھر پہ ہیں۔ کبھی کبھی وطن جاتا ہوں تو سب کو دیکھ بھال آتا ہوں۔ والد آرام سے ہیں اور باوجود اس پیرانہ سالی کے اب بھی دوسروں سے خدمت لینے کے بجائے دوسروں ہی کو آرام پہنچاتے ہیں۔ میں جاتا ہوں تو پھولے نہیں سماتے اور اب بھی میرا جی خوش کرنے کے لیے اور اپنا بھی، وہی باتیں کرتے ہیں۔ جو بچپن میں میرے لیے روا رکھتے تھے۔ میں تھوڑے ہی عرصہ کے لیے ان سے ملنے جاتا ہوں اور جلد واپس آجاتا ہوں، مجھے معلوم ہے اگر میں اُن سے ملنے کے لیے ذرا دیر اور ٹھہر جاؤں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی لیکن وہ جانتے ہیں کہ میں بیوی بچوّں میں جلد سے جلد واپس آجانا زیادہ عزیز رکھتا ہوں اس لیے اشارۃً کنایتہً بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے کہ میں تھوڑے عرصہ کے لیے اور ٹھہر جاؤں۔

میں تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا اور بولا، مولانا آپ کے سوال نے دل کے مدّتوں سے کُھلتے ہوئے سوتے کھول دیئے، ایسا تو نہیں کہ آپ اُکتانے لگے ہوں، علی گڑھ میں اس قسم کے خیالات شاذونادر ہی آتے ہیں۔ آپ کے سوال نے معلوم نہیں دل کے کون سے تار کو جنبش دے دی

کہ اس وقت طبیعت بے قابو ہو گئی - اس گفتگو کو میں کیوں نہ ختم کردوں
مرحوم پر اس وقت ایک ماورائی سی کیفیت طاری تھی - چونک پڑے،
کہا نہیں نہیں کہے چلو اب ختم کئے بغیر نہ رُکنا -

میں نے کہنا شروع کیا - سارا قصّہ اس اندیشہ سے نہیں دُہرانا چاہتا
کہ دوسروں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ جب
تک وہ باتیں معلوم نہ ہوں مرحوم کے اُس عمل ذہنی کا اندازہ نہیں ہو سکتا
جو میں یہاں بتانا چاہتا تھا - میری داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ میری علی گڑھ
کی زندگی اُس زندگی سے بالکل مختلف ہو گئی تھی جو میں اپنے والدین اور
اعزا کے ساتھ وطن میں بسر کر چکا تھا - اس زندگی میں جہاں میں گذشتہ
آلام و مصائب کو بھول چکا تھا وہاں اُن ذمہ داریوں کو بھی بڑی حد تک
نظر انداز کر گیا جو اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عائد
ہوتی تھیں وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ
میرے رنج و راحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں اتنا میں اُن کے
رنج و راحت میں ملول یا محزون نہیں ہوتا - فراغت کی زندگی کی یہ محرومی
اکثر میرے لیے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے -

میں اپنے بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا
چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ ان کے مسرّت کے پیالہ کو جو بہت ہی اتھلا
ہے اپنی ادنیٰ توجہ سے لبریز کردوں لیکن مجھ سے یہ ہو نہیں پاتا نفس جیسے
تراشتا ہے تو میں اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں -

مرحوم گردن جھکائے ساری داستان سُنا کیے، میں خاموش ہو گیا تو یک لخت چونک سے پڑے، فرمایا، بڑی بات کہہ ڈالی، اللہ بخشنے والا ہے خوب کہی، ٹھیک کہی، میرے دل کی بات کہہ دی۔ اللہ خوش رکھے، پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگے، کمر پر ہاتھ باندھ کر سر نیچا کیے دیر تک ٹہلا کیے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہہ دیتے۔ ٹھیک کہی بوڑھے پیتے کی بات کہی بڑی مبارک بات ہے نئی بات کہی، مرحوم کی اُس وقت عجیب حالت تھی، کبھی یہ معلوم ہوتا جیسے عالمِ جذب طاری ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے بہت مسرور و مطمئن ہیں۔ دیر تک یہ حالت قائم رہی۔ آخر میں کہا اس وقت جاؤ پھر کبھی اس پر بحث ہو گی۔

مرحوم کالج کے ضابطوں کے بڑے پابند تھے۔ رات کے وقت پکّی کچی بارکوں کے دروازے بند ہو جاتے تھے اور آمد و رفت کے لیے صرف وکٹوریا گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا تھا جس پر دربان مقرر تھا اور آنے جانے والوں کے نام و پتے لکھ لیتا۔ آدم جی پیر بھائی منزل (دو منزلہ) کے دروازے جس میں مرحوم تمام عمر مقیم رہے مارلیسن روڈ پر کھلتے تھے۔ مرحوم بڑی رات گئے تک بیدار رہتے لیکن یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم یا شخص آدم جی پیر بھائی منزل کے دروازے سے سیّد محمود کورٹ میں آ جا سکے۔ مسجد سے عشا کی نماز پڑھ کر واپس آتے، اور کچھ لوگ ساتھ ہوتے تو مرحوم ان کو کبھی اپنی طرف سے باہر نکلنے نہ دیتے ہمیشہ یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ وکٹوریہ گیٹ سے باہر جاؤ۔ اس میں طلبا

یا غیر طلبا کی کوئی تخصیص نہ تھی - اس پر طلبا یا دوسرے لوگوں سے کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوئی لیکن مرحوم نے اپنے اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا -

کم و بیش تیس سال تک دو منزلہ میں مقیم رہے اگر مرحوم علی گڑھ میں موجود ہوتے تو دو منزلہ میں مرحوم کا موجود ہونا بھی یقینی تھا - برخلاف دوسرے لوگوں کے یہ ناممکن تھا کہ مرحوم محض تفریحاً یا اخلاقاً کہیں اور ملنے ملانے چلے گئے ہوں - ہمیشہ اپنے مستقر پر ملے - سوا اس کے کہ کہیں شادی یا غمی کی تقریب ہو یا یونیورسٹی کے کام سے وائس چانسلر یا پرو وائس چانسلر نے طلب کیا ہو یا اپنوں میں سے کوئی بہت بیمار ہو - بہت کم لوگوں کو شاید معلوم ہو کہ مرحوم نے سوئمنگ باتھ نہیں دیکھا تھا ، کہتے تھے ادھر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی - یہ بات میں نے بہت کم لوگوں میں پائی -

یونیورسٹی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد پر جشن منایا جاتا جلسے ہوتے مرحوم ان میں کبھی نہیں شریک ہوئے - اس پر اکثر پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں لیکن مرحوم اپنی جگہ سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہوئے - کہتے تھے یونیورسٹی میں دولت و امارت کا کیا ہیچ - ایسے لوگوں کے لیے ساری دنیا پڑی ہے وہیں یہ ڈھونگ اچھا معلوم ہوتا ہے - یہاں علم و فضل دیکھا جاتا ہے - کوئی صاحب فضل و کمال آئے تو البتہ !

ایک بار میٹنگ تھی جس میں گفتگو تیز تیز ہونی شروع ہوئی ایسے

موقع پر مرحوم کب قابو میں رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں نے جو قریب ہی بیٹھے تھے۔ مولانا کو دبایا کہ خاموش ہو جانا ہی مصلحت ہے مرحوم نے چمک کر کہا:۔ خاموش کیسے ہو جاؤں وائسرائے کو ایڈریس نہیں دیا جا رہا ہے۔ علم و ایمان کے مسائل ہیں۔ خیال فرماتے ہونا۔ علم و ایمان کی آزمائش ہے، نیازمندی یا اطاعت شعاری کی نمائش نہیں ہے۔ میٹنگ سے واپس آنے کے بعد مجھ سے فرمایا اور کیوں جی یہ تم بھیگی بلی بنے کیسے بیٹھے رہے، میں نے کہا مولانا بس تھوڑی ہی سی کسر باقی تھی ورنہ آپ دیکھتے کہ بھیگی بلی گربہ عاجز بن جاتی۔ بڑے زور سے ہنسے پھر فرمایا "لیکن رہنے بلی ہی"

مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کھلم کھلا ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ مختلف الخیال لوگوں سے بھی بقول ان کے کھاتا کھلا ہوا تھا۔ خانقاہ سلیمانیہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابوبکر صاحب، محمد مقتدیٰ خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ بہادر، سید زین الدین صاحب تھے۔ باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بہاء الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا۔ مولانا ابوبکر صاحب کے بڑے مداح تھے، ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو رہا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا۔ تم تو جانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے جدا ہے۔ میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی تو بے نظیر نکلا۔

مولانا ابوبکر صاحب کو مُنہ کی تکلیف ہوئی اور علالت کسی قدر
تشویشناک صورت اختیار کرنے لگی۔ تو ایک دن بڑی بے قراری سے
فرمایا: اللہ شفا دے، یونیورسٹی کیا دور دور ایسا آدمی نہ ملے گا۔ علوم پر
بڑی اچھی نظر ہے۔ بڑی گہری نظر ہے۔ حاضر علم ہے بڑی متوازن شخصیت
ہے، نہ رعب کھاتا ہے نہ رُعب ڈالتا ہے، یہ بات مولویوں میں ناپید
ہے۔ پھر یاروں کا یار ہے۔ کہتے تھے ایسا معلوم ہوا جیسے طبیعت میں
گدگدی پیدا ہو گئی۔ کہنے لگے عجیب آدمی ہیں۔ کوئی کام ہو کسی کا کام ہو
کسی سے ہو، عبا پہنی رومال کندھے پر ڈالا اور ڈنڈا سنبھال کر گھر
سے نکل پڑے۔ یہ شخص فرض کو فرض سمجھ کر نہیں پورا کرتا بلکہ اس کے
ادا کرنے میں لطف اُٹھاتا ہے۔ آج کل دیکھو کس کرب میں مبتلا
ہیں لیکن معمولات میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ بات چیت کرنے میں
کوئی تردد یا اضمحلال، کتنوں کی ان کے دم سے پرورش ہے۔ ہاتھ کھلا۔
دل غنی بڑا اسرار آدمی ہے!

ذاکر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن ذاکر صاحب
نے کہا چلیئے مولانا سے مل آئیں۔ ہم جیسے پہنچے مرحوم استنجا کرنے جا رہے
تھے، میں کمرہ میں داخل ہوا، کہنے لگے "اخوہ یہ سواری باد بہاری کہاں
سے آئی، اچھا بیٹھ جاؤ استنجا کر آؤں۔ فوراً ہی ذاکر صاحب کمرہ میں
داخل ہوئے۔ دیکھتے ہی مسرت سے چہرہ جگمگا اٹھا۔ ایک خاص
اندازِ ترنم سے بولے!۔ اہو ہو ہو، "ڈاکٹر تم کہاں"؟ اہلاً وسہلاً۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ عرصہ سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ آج ارادہ کرلیا کہ ضرور جاؤں گا، بولے:۔ جزاک اللہ! جزاک اللہ۔ میری طرف مخاطب ہوکر بولے۔ خدا خوش رکھے۔ انہیں خوب لائے۔ خوب لائے۔ لوٹا زمین پر رکھدیا۔ میں نے کہا استنجے سے فارغ ہو آیئے۔ کہنے لگے نہیں اب نہیں۔ ڈاکٹر سے بات ہوگی اب سب کام ملتوی۔ یہ کہہ کر تخت پر جاکر دوزانو بیٹھ گئے۔ تخت پر مولانا کم بیٹھتے تھے۔ کوئی ہوتا یا آتا مرحوم معمولاً اپنی آفس کرسی پر گول میز کے سامنے دونوں پاؤں اٹھائے بیٹھے رہتے یا بیٹھتے۔ تخت پر دوزانو بیٹھنا خاص ہی خاص مواقع پر ہوتا۔ جب طبیعت نہایت شگفتہ ہوتی تو تخت پر آجاتے اور دوزانو بیٹھتے یہ ان ہی کا فقرہ ہے کہ اب اجلاس تخت پر ہوگا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ لطفِ صحبت میں کسی قسم کا خلل آنے نہ دیا جائے گا۔ اور صحبت پورے طور پر گرم ہوگی۔ چاء تیار کی گئی۔ شفاف سبزی مائل چائے۔ عنبر کی خوشبو سے معطر، تھوڑی شکر ملی ہوئی بغیر دودھ کے، خوشنما بلوریں فنجان میں۔ اس درمیان میں کوئی دوسرے درجہ کا آدمی آجاتا تو اسے فوراً رخصت کردیتے۔ اور کہہ دیتے اس وقت جاؤ پھر کبھی آنا۔

اس دن بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ بڑے لطف کی باتیں بڑی محبت کی باتیں اور بڑے پتے کی باتیں۔

میں نے بہت کم لوگوں کو مرحوم جیسی پر لطف باتیں کرتے سنا ہے۔ برمحل لطائف یا فقروں کی کمی نہ تھی۔ لطیفے وہ خواہ کیسے ہی ہوں

"بے ضغطہ زبان" کہتے تھے ان کی زبان پر بعض غیر ثقہ فقرے بھی بڑے مزہ کے معلوم ہوتے تھے۔ میرا ان کا بڑے عرصہ تک ساتھ رہا ہے۔ میں نے ان کو شاید ہی کبھی ایک ہی لطیفہ یا فقرہ دہراتے سُنا۔ میں ایسوں سے بھی واقف ہوں جو بڑے لسّان اور ذہین سمجھے جاتے ہیں لیکن دو چار صحبتوں کے بعد اکثر یہی معلوم ہوا کہ فقرے اور لطیفے رٹے ہوئے ہیں جو موقع بے موقع دہرا دیئے جاتے ہیں۔ برمحل اور اچھوتا فقرہ چُست کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ مرحوم کو اس میں خاص درک تھا۔

دینیات کے گھنٹہ میں اکثر طلبا لکچر کم سُنتے حاضری کی زیادہ فکر رکھتے اور تھوڑی بہت تفریح سے بھی باز نہ آتے۔ لیکن مولانا کی کلاس میں نظم و سکوت قائم رہتا اس میں شک نہیں کہ مرحوم سے طلبا مسرور بھی رہتے اور مرعوب بھی۔ ایک دن ایک طالب علم نے کلاس میں دریافت کیا۔ جناب والا! حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو فوج کی سرداری سے معزول کر دیا تو حضرت خالدؓ نے حضرت عمرؓ سے معزولی کی وجہ کیوں نہ دریافت کیں۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا حضرت خالدؓ نے تو جب وجوہ دریافت نہیں کئے تیرہ سو سال بعد اب آپ کو وجوہ دریافت کرنے کی کیوں ضرورت پڑ گئی، سمجھے نابندہ نواز ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالا کیجئے۔ آگے بڑھیئے!"

مولانا اپنی کلاس کے تقریباً تمام لڑکوں سے باخبر رہتے۔ ایک طالب علم کالج میں بہت مشہور تھے۔ مولانا کی کلاس میں کئی بار یوں سے تھیں

آئے تھے۔ مولانا نے دریافت کیا " کہاں ہیں وہ بندہ نواز گیسو دراز ؟"
ایک طالب علم نے جواب دیا کہ وہ آج کل بہت مصروف رہتے ہیں اور
کمرہ سے کم بر آمد ہوتے ہیں۔ دوسرے نے کہا فلاں فلاں کلاس میں
تو دیکھے گئے تھے۔ مولانا نے فرمایا " جی ہاں، ذرا کہہ دیجئے گا کہ
آجایا کریں۔ ع

میرے غم خانہ میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

میں نے انہیں جلال کے عالم میں بھی پایا ہے۔ علم و مذہب پر
گفتگو کرتے کرتے اکثر جلال میں آجاتے۔ لیکن اس جلالت کی شان ہی
کچھ اور ہوتی ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ علم یا مذہب کے بل پر یا اُن کے ناموس
کی حفاظت میں آمادۂ جہاد ہیں۔ تکبّر یا تبختر کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ لیکن
جب بے تکلف دوستوں کے حلقہ میں ہوتے تو ان کی باتوں میں شگفتگی،
رنگینی و زیبائی ہوتی، مرحوم یاد آتے ہیں تو میرے ذہن میں

"عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں"

کا نقشہ بھی پھر جاتا۔

مرحوم کے بڑے بھائی کا انتقال مرحوم کی رحلت سے کوئی دو سال
پہلے علی گڑھ میں ہوا۔ بڑے بھائی جنھیں مرحوم " بھائی جان" یا بھیا کہتے تھے
مدتوں سے جنون میں مبتلا تھے، بولنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ چپ چاپ
ادھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ کسی سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے اور
نہ کسی کے لیے تکلیف دہ تھے۔ مولانا مرحوم، بڑے بھائی سے اس حال میں

معنوں میں دیوبند، سہارنپور وغیرہ کے مذہبی یا دینی ادارے ہیں۔ یہ ایک دنیوی تعلیم گاہ ہے جس میں طلبا کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو ضروریات زمانہ میں ان کی کفیل ہو اور دنیوی مطالبات پورا کرنے میں ان کی مدد کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مسلمانوں کا علمی ادارہ ہے۔ اس لیے اس میں صرف اتنا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ہمارے طلبا اسلام کے اعلیٰ تصورات معاد و معاشرت سے آشنا رہیں اور علوم جدیدہ یا معاشرت حاضرہ کی زد میں آکر اسلامی شعائر و اسلامی روایات سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ یونیورسٹی میں عبادت سے زیادہ اعتقاد کو صحیح رکھنے کا التزام رکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد کی منزل یہ ہے کہ اعتقاد عمل کی کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ جس اعتقاد پر عمل کا جامہ ٹھیک نہ آئے وہ اعتقاد نہیں ذہنی تعیش یا گمراہی ہے۔ مسلمانوں کا عمل عبادت ہے عبادت عمل نہیں، یہاں یہ چیز ہمارے آپ کے عمل سے پیدا ہو سکتی ہے قواعد کے شکنجوں یا تعزیرات کے خوف سے نہیں۔ مسلمان بنے رہو مسلمان بنتے رہیں گے۔ قواعد قانون بدلتے رہیں گے۔

مرحوم کا سیاسی مسلک جمعیتہ العلما کا تھا اور جہاں تک شعائر اسلامیہ کا تعلق تھا وہ بدعات شرعیہ کے سخت مخالف تھے۔ فاتحہ، پیر پرستی اور اس قسم کی دوسری باتوں کے بالکل قائل نہ تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے وہ بڑے حامی تھے۔ تمام عمر ان کا لباس گزی گاڑھے کا

رہا۔ سر پر عمامہ اور پاؤں میں پنجابی جوتہ۔ صرف سخت سردیوں میں کوئی معمولی سا موزہ پہن لیتے۔

مجھے یاد آتا ہے ایک صحبت میں جمعیتہ العلما اور کانگریس کے سیاسی مسلک پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی مرحوم چبوترہ پر اپنی عبا اور عمامہ سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے تھے۔ حاضرین میں سے کسی شخص نے جو جمعیتہ العلماؑ اور کانگریس دونوں سے بیزار تھے جمعیتہ کے سیاسی مسلک پر نکتہ چینی کی۔ مولانا اٹھ بیٹھے، کہنے لگے: بھائی انصاف کرو اور حد سے متجاوز نہ ہو۔ علماؑ میں ہزار عیب سہی لیکن انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش میں کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے۔ آج کل لوگ زیادہ تر تقریر کرتے ہیں تجویز پیش کر دیتے ہیں یا ستیاگرہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے زمانہ میں جب حکومت کی مخالفت کرنا کچھ بہت زیادہ نقصان رساں یا تکلیف دہ نہیں ہے۔ علماؑ نے تو اس وقت سے آزادی کا علم بلند کر رکھا ہے۔ جب ہندوستان میں آزادی کے نام سے بھی کوئی آشنا نہ تھا اور آزادی و بغاوت ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ کانگریس کے نام تک سے کوئی واقف نہ تھا علماؑ پھانسی پر چڑھائے گئے ان کے گھر ڈھائے گئے، ان کو کالا پانی بھیجا گیا۔ ان کے عورتوں بچوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے۔ تم لوگ تو ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہو کچھ بیچارے علما کی بھی تاریخ پڑھی ہوتی، آج ہندو آزادی کے معاملہ میں علماؑ سے آنکھ برابر نہیں کر سکتا۔

مولانا نے اس سلسلہ میں ہندوستان کی تاریخ جہاد پر مسلسل اور دل نشین تقریر کی۔ علماء کے بہت سے تباہ شدہ خاندانوں کا حال سنایا، جہاد پر جو نظمیں جب کبھی لکھی گئی تھیں اور ضبط ہوئیں اُن سب کو سنایا، جہاد کی تحریک جس طور پر شروع ہوئی۔ جو لوگ شریک ہوئے اور ان کا جو کچھ انجام ہوا سب سنائے پھر بولے: دوستو برا نہ ماننا تمہارے مصالح یا تمہاری کمزوری اپنی اپنی جگہ پر چاہے جیسی ہو مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں، لیکن ایسا تو نہ کرو کہ جن لوگوں نے ہندوستان اور اسلام کی آزادی میں مصالح کو ٹھکرا دیا ان کو تم ٹھکراؤ۔ زندگی کے لطف اٹھاتے ہو، خوب اُٹھاؤ، خدا مبارک کرے اور برکت دے۔ مگر ایسی بات مُنہ سے نہ نکالو جس سے کبھی تم کو ائمہ و اسلاف کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

مولانا کی اس تقریر سے حاضرین پر اوس سی پڑ گئی۔ لیکن اس کے بعد ہی مولانا نے گفتگو کا رُخ اس طور پر بدل دیا کہ بات آئی گئی ہوئی اور سب لوگ ہنستے بولتے رخصت ہوئے۔ مرحوم نے یہ تقریر کچھ یوں ہی نہیں کر دی تھی بلکہ اس کی تہ میں مرحوم کے خاندان کی بعض روایات بھی ہیں۔

مولانا کے دادا مولانا سخاوت علی فاروقی محمدی مہاجر مکی تھے ممدوح شاہ عبدالحی صاحب دہلوی اور امیر المجاہدین مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید نبیرۂ حجۃ اللہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ کے شاگرد تھے اور امیر المومنین

حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ۔ ان شہید بن سعید بن کے فیض صحبت سے مولانا سخاوت علی رحمۃ اللہ علیہ میں مجاہدانہ سرگرمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ۱۲۵۶ھ میں یہ مردِ مجاہد ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر مکہ معظمہ کو ہجرت کر گیا۔ مولانا سخاوت علی مرحوم کا قائم کیا ہوا مدرسہ قرآنیہ اب بھی جون پور میں قائم ہے جس کی ترقی و نگرانی بتدریج مولانا ابوبکر صاحب مرحوم کے چچا مولانا جنید صاحب مرحوم اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور مرحوم کے والدِ ماجد مشہور عالم باعمل حضرت مولانا ابوالخیر محمد مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوئی جن کے بعد مولانا مرحوم اس مدرسہ کے مہتمم و ناظم ہوئے۔ مولانا سخاوت علی مرحوم نے اپنے عہد میں جیسے جیسے نازک موقع پر دین کی خدمت کی اور ان کے فیض صحبت سے جیسے جیسے علمائے دین پیدا ہوئے وہ پوربی نواح میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

جس صحبت کا اوپر ذکر آیا ہے میں اس میں موجود تھا اور پورے طور پر محسوس کر رہا تھا کہ مولانا جو کچھ فرما رہے ہیں اس میں اس حرارت کا بڑا دخل ہے جو مولانا کو براہِ راست وراثۃً پہنچی تھی۔

مولانا کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا پرایا بڑی خوش دلی اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بعضوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنا یا دوسرے کا کام کریں گے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی کرتے رہیں گے۔ کبھی مصروفیت سے کبھی ناسازیٔ طبع سے

کبھی اپنے نقصان سے کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانے سے۔ پھر کر چکیں گے۔ تو احسان منوانے یا اپنی اہمیت و عظمت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ نہ دیں گے۔ اکثر ایسے بھی ملیں گے جو ادنیٰ سا کام کریں گے جس کے کرنے کا ان کو کافی معاوضہ بھی ملتا ہے، لیکن اس کا اعلان و اظہار اس طور پہ کریں گے گویا کوئی بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں۔ یا اُن پہ بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مرحوم اس کے بالکل برعکس تھے۔ معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا، وہ اس کو اس طور پہ کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ غیر شعوری طور پہ سانس لیتے ہیں بغیر کسی قسم کا اعلان کئے اور بغیر کسی معاوضہ کی توقع کے اور ختم کرتے تو بس ختم کر دیتے بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

شعبۂ فنون کے ایک طالب علم نے "اکیڈمک کونسل" سے ایک بار ایسے مضامین اختیار کرنے کی اجازت چاہی جو مقررہ اوقات تعلیمی میں مخل ہوتے تھے۔ کونسل میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اراکین نہ تو یہ چاہتے تھے کہ ٹائم ٹیبل کی دقتوں میں اضافہ ہو اور نہ اس طالب علم کی درخواست کو اسی بنا پر مسترد کرنا گوارا کرتے تھے جب کافی بحث ہو چکی تو مولانا نے فرمایا: کونسل اجازت دے دے جس مضمون کی تعلیم کی گنجائش نظام اوقات میں نہیں نکلتی وہ مرحوم کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ اپنے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس طالب علم کو پڑھائیں گے چنانچہ اس طالب علم کو مولانا نے دو سال تک مسلسل انتہائی

پابندی وانہماک سے اپنی فرصت کے اوقات میں تعلیم دی۔

اپنے عملہ میں مولانا کو بعض بڑے نالائقوں سے بھی سابقہ ہوا لیکن وہ ان سے اس طور پر نباہ کرتے تھے۔ کہ ہر شخص کو حیرت ہوتی تھی مؤذنوں اور پیش اماموں کی بڑی خبر گیری کرتے تھے، ان سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ ان سبھوں کو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ مولانا ان کے افسر تھے، ان کے کاموں میں کبھی کوئی عیب یا نقص نہ نکالا، ان کی ذاتی دقتوں کو اپنا لیتے۔ مولانا کے سپرد جو انتظامات تھے ان کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ قسم قسم کے مسائل اور طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا لیکن میں نے کبھی نہ دیکھا کہ مولانا کسی قسم کے تردد یا دوا دوش میں مبتلا ہوئے ہوں۔ کمیٹیاں ہو رہی ہوں کاغذی گھوڑے دوڑائے جا رہے ہوں اور ایک ہنگامہ برپا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولانا کی منشا خود بخود ہر جگہ پوری ہو رہی ہے، اور مولانا کا ہر ماتحت یا ان کے ساتھ کام کرنے والا اپنا ذاتی کام سمجھ کر ہر فرض سلیقہ اور محنت سے ادا کر رہا ہے۔

ایک دن ہم سب سید بشیر الدین صاحب مہتمم یونیورسٹی لائبریری کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے، مولانا بھی اپنے خاص اندازِ دل آسائی و خود اعتمادی کے ساتھ آگئے۔ سب لوگ تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا نے بغیر کسی تکلف یا مصنوعی اخلاق کے فرمایا، ارے میاں بیٹھے بھی رہو۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں اور کیوں بشیر! ہمارا "صاحب" کہاں ہے؟ (یہ

سید محمود حسین صاحب لیکچرر شعبۂ انگریزی کی طرف اشارہ تھا) بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی ۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں اثنائے گفتگو میں بشیر صاحب نے کہا کہ لائبریری کے قلمی اور مشرقی نسخوں کو حال ہی میں ٹیوٹوریل روم سے لائبریری کو منتقل کیا گیا ہے کتابیں بے ترتیب ہو رہی ہیں ۔ ان کتابوں کی باقاعدہ فہرست بن جاتی تو بڑا اچھا ہوتا ۔

مولانا نے فوراً فرمایا ۔ فکر کی بات نہیں ہے ، یہ بھی کوئی کام ہوا طفیل احمد سے کہو مجھے یہ ذخیرہ دکھا دیں ۔ میں فہرست تیار کر دوں گا ۔

بشیر صاحب نے کہا : مولانا بڑا پتہ مار کام ہے ، آپ کیوں تکلیف کریں ۔ مولانا نے فرمایا بھئی ذرا دیکھوں تو سہی ، جس کام کو نوجوان پتہ مار کہتے ہیں ۔ اسے بوڑھوں کو کم سے کم دیکھ تو لینا چاہیے ۔ غرض مولانا نے کام شروع کر دیا ۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی مدتوں مسلسل ہر روز کئی کئی گھنٹے لائبریری کے ایک گوشہ میں بیٹھے کام کرتے رہے اور بالآخر فہرست مکمل کر دی ۔ مولانا نے کبھی اس کا بھول کر بھی ذکر نہ کیا کہ وہ کس کام میں مصروف تھے یہاں تک کہ کام بہمہ وجوہ مکمل ہو گیا اس وقت بھی کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا ۔ ایک عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مولانا نے فہرست مکمل کر دی ، تو میں نے ہنس کر مولانا سے کہا : مولانا یہ آپ خواہ مخواہ کا دردِ سر کیوں خریدتے رہتے ہیں ۔ کہنے لگے ۔ تم بھی عجیب آدمی ہو ۔ یہ بھی کوئی کام ہوا ، بشیر کو اس کی فکر تھی ، میں نے کہا کام بھی اچھا ہے فرصت بھی ہے کچھ دن اسی کی سیر رہے ۔ اس فہرست کے

مرتب کرنے میں مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ بعض نوادر کے دیکھنے کا مفت میں موقع مل گیا۔ اس ذخیرہ میں بعض ایسی کتابیں دیکھنے کو ملیں جن کو میں سمجھتا تھا کہ ناپید ہیں، کسی کا صرف سنا تھا، ان کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ کچھ ایسی بھی ملیں کہ اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا!

اسی طرح دینیات کی لائبریری کو بھی مرحوم نے خود اپنے ہاتھ سے ازسرِنو ترتیب دیا۔ کتابوں کے انتخاب میں بڑی توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے۔ علوم اسلامیہ پر جو کتابیں بیرونِ ہندوستان شائع ہوتیں مولانا کی ان پر خاص نظر ہوتی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کونسی کتاب کہاں شائع ہوئی اکثر پوچھتے رہتے کس یورپین مستشرق نے اسلامی ادب شاعری یا اس قبیل کے کسی اور موضوع پر تصنیفات شائع کیں۔ ان کے علاوہ مرحوم کو ان کتابوں سے خاص دلچسپی ہوتی جو مذہبی مباحث پر اُردو میں شائع ہوئیں۔

اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زبان تو اُردو ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ براہ راست عربی فارسی سے استفادہ کرنے والے اب صرف وہ لوگ رہ گئے ہیں۔ جو تحقیقاتِ علمیہ کا کام کرتے ہیں ورنہ عام طور پر اب ساری مذہبی معلومات اُردو ہی کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ مولانا کی وسعتِ نظر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ان تمام اُردو کتابوں کو دینیات کی لائبریری میں جگہ دیتے تھے جو فلسفہ مذہب، اخلاقیات یا اس قسم کے دوسرے مباحث پر یورپین زبانوں سے

آردو میں منتقل ہوئی تھیں ۔ فرماتے تھے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں یونانی کتب کے ترجمہ سے اسلامی تصوّرات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا اس سے کہیں دُور رس نتائج موجودہ عہد میں پیش آنے والے ہیں۔ کیونکہ فلسفہ کی ترقی سائنس کے انکشافات، مطبوعات کی اشاعت، ملنے ملانے کی سہولتیں، عوام و خواص دونوں کے ذہن و افکار کو بڑی سرعت اور شدّت سے متأثر کر رہی ہیں۔ اس لیے ان مطبوعات پر نظر بہت ضروری ہے۔

یونیورسٹی کا قبرستان آج سے دس بارہ سال پہلے بے آب و گیاہ بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ نہ کوئی سایہ دار درخت، نہ وہاں پہنچنے کا ڈھنگ کا کوئی راستہ، نہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی کوئی ستھری معقول جگہ، نہ محافظ قبرستان کے رہنے سہنے کا کوئی انتظام، نہ میّت کے لے جانے کے لیے کوئی تابوت اسی طور پر یونیورسٹی کی مسجد میں کوئی وضوخانہ نہ تھا لوگ حوض کے گرد بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ ناک تھوک سے پانی کو پاک و محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میّت کو غسل دینے اور کفنانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ مولانا نے نہایت خاموشی اور مستعدی کے ساتھ رفتہ رفتہ انتظام کر دیا۔

گورستان کا اب یہ عالم ہے کہ شاید اس سے زیادہ سبز اور سایہ دار جگہ یونیورسٹی میں کوئی اور نہیں ہے۔ صاف پختہ سڑک بن گئی ہے۔ محافظ گورستان مع تمام ضروری سامان کے چوبیس گھنٹہ وہیں موجود

رہتا ہے۔ نمازِ جنازہ کی جگہ متعین ہے اور صفیں بنی ہوئی ہیں۔ اس کا بھی انتظام ہے کہ وفعتاً کوئی موقع آجائے۔ اور معقول انتظام جلد اور بروقت نہ ہوسکے تو تکفین و تدفین کا پورا سامان موجود ہے۔ مسجد میں نہایت ہی ستھرا اور خوب صورت وضو خانہ ایک روشن اور محفوظ برآمدہ میں بنا دیا گیا ہے۔ غسلِ میت اور تجہیز و تکفین کے لیے مسجد ہی سے ملحق لیکن الگ تھلگ ایک جگہ خاص مخصوص کردی گئی ہے یہ انتظامات جتنے ضروری تھے اتنا ہی ان کی طرف ذہن کم منتقل ہوتا تھا۔ لیکن مولانا کو اس کا پورا احساس تھا اور انھوں نے بعض دشواریوں کا نہایت خاموشی سے مقابلہ کرکے ان سب کا مناسب انتظام کردیا۔

ایک بار یونیورسٹی میں اس کا بڑا چرچا تھا کہ لڑکے کثرت سے سینما دیکھنے جایا کرتے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس سے باہر شہر کے اندر رات کے وقت نوجوان طلبا کا ایسے موقع اور مجمع میں موجود ہونا سُنکر کسی طرح قابلِ اطمینان نہیں کہا جاسکتا، بُرا ہے اس سے ان کے خصائل و اخلاق پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اور حکام یونیورسٹی کے انتظامات میں بھی بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اس سے یہ بہتر ہوگا کہ خود یونیورسٹی کے احاطہ میں سینما ہال کھولنے کی اجازت دی جائے جس پر یونیورسٹی کے مقرر کردہ قیود عائد ہوں۔

دوسرے یہ کہتے تھے کہ سینما قطعاً مخربِ اخلاق ہے۔ اس کے علاوہ خود یونیورسٹی میں اس کا انتظام ہونے دینا بڑی غلط فہمیوں کا باعث ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی میں " ڈرامیٹک سوسائٹی " پر بھی اعتراضات کیے جا رہے تھے کہ یہ چیز درسگاہ میں نہ ہونی چاہیئے۔

ایک دن اثنائے گفتگو میں میں نے پوچھا مولانا اس سینما اور ڈرامیٹک سوسائٹی کے بارہ میں مذہبی نقطۂ نظر کیا ہے۔ مرحوم نے فرمایا آخر مذہبی ہی نقطۂ نظر کے پیچھے کیوں پڑتے ہو معلوم ہوتا ہے تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ مولوی سوا مذہبی نقطۂ نظر کے کسی اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اور نہ خود اپنی کوئی رائے رکھتا ہے۔ مجھے یہ تو بتاؤ مذہبی نقطۂ نظر معلوم کرنے کی تم کو اتنی فکر کیوں ہے اس نقطۂ نظر پر عمل کرو گے۔ ہندوستان میں بحالت موجودہ اس پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ آخر اس پر کیوں نہیں راضی ہو جاتے کہ مذہبی نقطۂ نظر کے پیچھے پڑے بغیر بھی معقول پسندی اور حسنِ تدبیر کو دخل دیا جا سکتا ہے۔

میں نے عرض کیا مولانا بات تو ٹھیک ہے لیکن میں ذرا کند ذہن اور صلح پسند واقع ہوا ہوں معقول پسندی سے بڑی ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اُن سے کون نپٹے۔ مذہبی نقطۂ نظر میں یہ آسانی ہے کہ جب جی میں آیا خود جامہ سے باہر ہو گئے اور جب جی چاہا کسی بھلے مانس کی پگڑی اچھال دی! مولانا اپنے خاص انداز میں بغیر آواز کی ہنسی خوب ہنسے، پھر اپنے رومال سے چہرہ پونچھتے اور رومال کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے دیکھو اسلام ایک مجموعہ ہے مخصوص معتقدات اور مکمل اعمال کا۔ اس کا ہر جزو کل میں دیکھنا چاہیئے نہ یہ کہ کل کو

نظر انداز کر کے جز و پر کٹ مرے ۔ جہاں اسلام کا مکمل، مستقل و مؤثر نظام نافذ نہ ہو وہاں ہر مسئلہ یا ہر تحریک کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنا بیکار اور اُس کو بروئے کار لانے کی کوشش مضر ہے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر اس پر عمل کیا جائے ۔ یہ بحث بہت طویل ہے، کسی مستقل اور معقول صحبت میں اس پر مفصل گفتگو ہو گی ۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ جب کسی ناگزیر خرابی یا قباحت کا انسداد ناممکن ہو تو انسداد کی نہیں بلکہ اصلاح کی کوشش کرنا چاہیئے! اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ ڈراما میں سوانگ بھرنا، گانا، ناچنا اور مصنوعی حرکات یا باتیں کرنا مردوں کا بالخصوص مسلمانوں کو زیب نہیں دیتیں ۔ ورزش، تفریح، تعلیم، کارکردگی یا اظہار کمال کی اور بہت سی معقول صورتیں بھی تو ہیں ۔ آخر ڈراما ہی کو سب کچھ کیوں سمجھ لیا جائے اچھے ڈرامے لکھو اور اپنی فکر کی زیبائی و رسائی کا ثبوت دو ۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اُسے کرنے بھی لگو ۔ فنونِ لطیفہ کو جو معنی بالعموم پہنائے جاتے ہیں ۔ اسلام نے اس کو گوارا نہیں کیا ہے ۔ لیکن فنونِ لطیفہ کی تعبیر میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں ۔ اسلام طبیعت کی اپج کو نہیں روکتا البتہ اس کی نامعقول تعبیر و تشکیل کا احتساب کرتا ہے مسلمانوں کا جمالیاتی تصور کسی سے کم نہیں ۔ انسانی اعمال و افکار کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہو گا ۔ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بے سر و پا نہیں ہے ۔

علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ کو علی گڑھ اس لیے عزیز ہے کہ اس میں ہر ذوق کی تسکین و تفریح کا سامان مہیا ملتا ہے۔ جو شخص جس قماش کا ہوگا اس کو اسی قسم کی مکمل سوسائٹی میسر آ جائے گی۔ علی گڑھ کی ہر دلعزیزی کا یہی راز ہے ورنہ مقامی اعتبار سے علی گڑھ میں کوئی جاذبیت نہیں ہے۔ دوسرے بڑے شہروں کے برخلاف یہاں نہ اعلیٰ درجہ کی دکانیں ہیں نہ مناظرِ فطرت نہ تفریح گاہیں۔ یہاں کا کوئی شخص محض تفریح کی خاطر کبھی شہر نہیں جاتا۔ اور نہ کسی کے لیے یونیورسٹی کی حدود سے باہر دل بستگی کا کوئی سامان ہے۔ ہر شخص کو اپنے ہی مخصوص حلقہ میں دلچسپی کا سارا سامان میسّر آ جاتا ہے۔

پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، شوخی شرارت، کھیل کود، رندی و پارسائی غرض یونیورسٹی کی مکمل زندگی میں جن اسباب یا مواقع کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ وہ سب یہاں ملتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے جب کبھی اور جہاں کہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں فوراً بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اُن کو تصنع یا تکلف کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ اس قسم کے طرزِ عمل پر قادر رہ سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فریقین ایک دوسرے کی اچھائی برائی سے واقف اور علی گڑھ کی روایات سے آشنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے کبھی اجنبی کی حیثیت سے نہیں مل سکتے۔

مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اتفاق سے بھی کسی صحبت میں پہنچ جاتے تو حاضرین میں سے کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ کوئی اجنبی مخلِ صحبت

ہوا ہے چہ جائے کہ وہ مولوی ہو جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کی چول کسی خانہ میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ یونیورسٹی میں ہر طرح کے لوگ اور ہر طرح کی سوسائٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے مخصوص حلقوں کے مخصوص طور طریقے ہوں گے۔ کوئی پھکڑ ہے۔ کوئی سنجیدہ کسی کو سیاسی مسئلہ سے دلچسپی ہے تو کسی کو مذہبی باتوں سے تسکین ہوتی ہے۔ زندگی کو کوئی کسی زاویہ سے دیکھتا ہے، کوئی کسی زاویہ سے۔ کوئی کچھ ہے اور کوئی کچھ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مرحوم یونیورسٹی کے ناظم دینیات تھے جس پر منصب کے اعتبار سے خاص خاص پابندیاں عائد ہوتی تھیں۔ اور انھیں پابندیوں کے اعتبار سے اس کے کردار، گفتار متعین ہوتے تھے۔ بایں ہمہ یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کی غیر متوقع آمد پر بھی لوگ خوش اور بشاش ہو جاتے تھے گفتگو کی روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہ آتا اور لوگ آرزو کرتے کہ مولانا بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوں۔

مرحوم کی سیرت و شخصیت کا کمال یہ تھا کہ کبھی کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے تھے اور نہ دوسرا متجاوز ہو سکتا تھا۔ مرحوم کو خدا نے ایسا متوازن دل و دماغ دیا تھا۔ اور ان کی شخصیت اتنی دلآویز تھی کہ ان کو اپنے منصب کی آڑ پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور نہ انھوں نے اپنے طور طریقوں سے کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناظم دینیات یا عالم دین تھے۔

ممکن ہے میرے محض اتنے سے بیان سے بعض لوگ غلط فہمی میں

مبتلا ہو جائیں اس لیے میں اس کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

فرض کیجیے کسی مذہبی یا اخلاقی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے، مولانا کبھی کوئی آیت یا حدیث نہ پڑھیں گے اور نہ ائمہ و اکابر کے اقوال پیش کریں گے وہ بالکل ایک معمولی انسان کی طرح بحث میں حصہ لیں گے اور اپنا نقطۂ نظر اس طور پر پیش کریں گے کہ آپ کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ہمت ہوتی رہے گی اور بحث میں آپ کی دلچسپی بڑھتی جائے گی چنانچہ آپ یہاں تک محسوس کرنے لگیں گے کہ اس سے بہتر کوئی اور موقع اس مسئلہ کو سلجھانے کا نہیں ہے۔

اس قسم کے اکثر مواقع پیش آتے رہتے تھے میں مولانا کی خدمت میں ایک حد تک بے باک تھا۔ اور میری ان باتوں سے مولانا مجھے اور زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار ایک طویل "علمی مذاکرہ" کے بعد میں نے مولانا سے عرض کیا: مولانا بات تو آپ ٹھیک کہتے تھے لیکن یہ ساری باتیں بدیہہ گوئی و بدیہہ آفرینی کے سلسلہ میں تھیں۔ یا اللہ اور رسولؐ کے کلام سے بھی ان کی سند ملتی ہے۔ مولانا اپنی ذہین اور دل نشیں آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہی اپنی مخصوص ہنسی ہنسے جس میں آواز بالکل نہیں نکلتی تھی، لیکن ہنسی کے زور سے سارا جسم جھٹکے کھانے لگتا تھا پھر فرمایا: تمھارے سوالات بھی خوب ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ اور رسولؐ کے بارہ میں آج کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرنے والے ہو۔

میں نے عرض کیا: مولانا فیصلہ کن، نہیں فیصلہ ہی کہیے اس لیے

کہ میں فیصلہ تو اکثر کر لیا کرتا ہوں البتہ اس میں ایک بڑی کمزوری یہ
رہ جاتی ہے کہ فیصلہ تو میں کرتا ہوں لیکن کُن اللہ میاں نے اپنے ہاتھ میں
رکھا ہے۔ مولانا اس فقرہ سے بہت محظوظ ہوئے، پھر فرمایا: میں جو کچھ کہتا
تھا اس کی تصدیق "کلام الٰہی" اور "حدیث نبوی" سے ہوتی ہے چنانچہ
مرحوم نے آیاتِ قرآنی سنائیں، احادیث کا حوالہ دیا غرض ہر بات پورے
طور پر منقح کر دی۔

مرحوم کا یہ خاص وطیرہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ چھڑتا تو جب تک
اُن سے خاص طور پر رجوع نہ کیا جاتا وہ خواہ مخواہ مباحثہ میں شریک نہ ہوتے
بر خلاف بعض لوگوں کے جن کی عام عادت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ جو کچھ
جانتے ہیں۔ اُسے بے تکان بتانا شروع کر دیں گے۔ اور یہ کوشش کریں گے
کہ لوگ اُن کے فکر و نظر کے قائل ہو جائیں۔ چنانچہ اس وقت تک نہ چپ
ہوں گے جب تک ان کا مبلغ علم ختم نہ ہو جائے یا لوگ حفاظتِ خود اختیاری
میں بھاگ نہ کھڑے ہوں!

لیکن جب کوئی بات مولانا سے رجوع کی جاتی تو وہ نہایت خوشی،
نہایت اطمینان اور نہایت اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے! در علوم و احکام دینیہ
کے تمام نکات وضاحت کے ساتھ بیان کرتے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے
جن پر ائمہ کو اختلاف ہوتا، اُسے بھی صفائی و صداقت کے ساتھ واضح کر
دیتے مرحوم کو علومِ دینیہ پر بڑا عبور تھا۔ کتابوں کے حوالے اور اکابر کے
اقوال دیانت اور وثوق سے پیش کرتے۔ اس وقت مجھے یہ حیرت ہوتی

کہ یہی مولانا جواب تک ہم سب کے ساتھ خوش گپی میں مصروف تھے ایک "متبحر عالم" کے فرائض کس خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

مرحوم کو عام طور پر گفتگو کرتے بار ہا سنتے دیکھ کر کسی کو مشکل یہ گمان ہوتا کہ مرحوم کا علم کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ ہم سب بھی آخر لکھنے پڑھنے ہی کا شغل رکھتے ہیں، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو علوم جدیدہ سے پورے طور پر آشنا ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو دونوں علوم پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ علوم دینیہ سے پورے طور پر آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم اس امر کا تو پتہ لگا ہی سکتے ہیں کس مبحث میں کس کا کون سا پہلو کمزور ہے۔

میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ مولانا مذہبی نقطۂ نظر اس انداز سے پیش کر رہے ہیں گویا وہ خالص مذہبی نقطۂ نظر نہ تھا۔ بلکہ اُن کے مدِ نظر ہمارا ہی اصولِ بحث تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے مولانا ہمیں لوگوں میں سے ایک تھے اور ہمارے ہی علوم سے بحث کر رہے ہیں وہ بحث میں ایسی مثالیں پیش کرتے جو موجودہ دور میں مثال مبہمہ نہیں بلکہ مسلمہ فیصلے تھے جن پر تجربات جدیدہ کی مہرِ استناد لگی ہوئی تھی۔

علومِ اسلامیہ میں جو تبحّر مرحوم کو تھا اس سے قطعۂ نظر دیگر علوم و فنون سے بھی مولانا کو بڑی دلچسپی تھی۔ مرحوم کو ریاضی میں بڑا درک تھا میں نے ریاضیاتِ جدیدہ کے بعض کاملین کو یہ کہتے سُنا کہ مولانا کو "ریاضی" اور "اقلیدس" پر بڑا عبور تھا۔ عربی میں ریاضی کا جو سرمایہ ہے،

اس کا معقول حصّہ مولانا کی نظر سے گزر چکا تھا۔ فلکیات سے مرحوم کو خاص لگاؤ تھا۔ رات میں چبوترے پر لیٹے ہوئے جن جن ستاروں کے عجیب و غریب نام عربی فارسی میں آئے ہیں ۔ ان سب کو دکھاتے بتاتے ۔ ایک دفعہ سمتِ قبلہ کی بحث آگئی مولانا نے قطب تارہ کا مقام اور مختلف متعلقہ ستاروں کو ایک ایک کرکے بتایا۔ عہدِ پیشین کے ماہرینِ فلکیات نے اپنے اپنے حساب کی رُو سے جن ستاروں کا جو محل یا مقام بتایا تھا اور امتدادِ زمانہ سے ان میں اب جو تفاوت پیدا ہو گیا ہے ان سب کو بڑے لطف و فصاحت سے بیان کیا۔ اسی سلسلہ میں جنتریوں کی مفصّل تاریخ اور ان کے اصولِ ترتیب و تدوین بھی سُنائے ۔

ایک دن کہنے لگے، او دیکھوں جی رشید! غالبؔ کے کلام میں "بنات النعش کا نام آیا ہے، اُن کو دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: جی نہیں۔ فرمایا دیکھو گے، میں نے کہا: اب کیا دیکھوں، ان کے دیکھنے کا لُطف تو غالب ہی کے زمانہ میں تھا یونیورسٹی کے عہد میں دیکھ کر کیا کرونگا۔ ہوں گی بھی تو پلیٹ فارم ہی میں ہوں گی ورنہ آپ دعوتِ دید کیوں دیتے! مولانا بہت لطف اندوز ہوئے ۔

اکثر صحبتوں میں نظیریؔ اور غالبؔ کے کلام پر محاکمہ کیا جاتا۔ اس وقت معلوم ہوتا کہ مولانا کا فارسی شاعری اور فارسی ادب کا ذوق کتنا پاکیزہ اور سُلجھا ہوا تھا مرحوم کے سامنے اردو کا کوئی اچھا شعر پڑھا جاتا تو اکثر وہ اس سے ملتے جُلتے مضمون کا فارسی یا عربی شعر سُنا دیتے ۔

مرحوم کو صرف عربی فارسی کی ادبیات سے ذوق نہ تھا بلکہ اُردو اساتذہ کے بھی اَن گنت اشعار یاد تھے۔ اشعار مزے لے لے کر پڑھتے تھے محسن کاکوروی کی تقریباً ہر مشہور نظم یاد تھی، جس کو ایک خاص ترنّم سے پڑھتے، اکثر کہا کرتے تھے کہ مذہبی معتقدات کو لکھنوی شاعری میں جس طرح محسنؔ نے سمویا اور نباہا ہے وہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

اسلامی قانونِ وراثت پر بڑی اچھی اور گہری نظر تھی قانون کے اکثر طلبا فرائض کی تقسیم سمجھنے کے لیے مولانا کے پاس آیا کرتے تھے! اور اُن طلبا کو پورے طور پر مطمئن کر دیتے تھے۔

عرصہ کی بات ہے یونیورسٹی میں ایک ہنوٹ ماسٹر رکھے گئے تھے بڑے شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ اور اس فن کے امامِ وقت تھے۔ مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم اُن پر بہت مہربان تھے اور اپنے دوستوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ بھی ہنوٹ سیکھیں۔ اکثر اصحاب نے سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب جن کی نظر سے یہ سطور یقیناً گزریں گی اپنا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن نمازِ فجر کے بعد مرحوم گھومتے گھامتے ان کے گھر جا پہنچے۔ باتوں باتوں میں پوچھنے لگے اور کیوں صاحب کچھ ہنوٹ کی بھی مشق بہم پہنچائی انھوں نے فرمایا: جی ہاں دو چار ہاتھ سیکھے تھے لیکن اِدھر ناغہ ہوتا رہا۔ اس لیے مشق و صفائی کی نوبت نہ آئی۔ پیچ اور پینترے بھی کچھ بھولنے لگا ہوں۔

مرحوم نے فرمایا: اچھا مجھے بتلائیے کیا سیکھا تھا، چنانچہ انھوں نے

دو چار ہاتھ دکھائے مرحوم نے فرمایا: اچھا آؤ میں مشق کرا دوں صاحب کا بیان ہے کہ مولانا مرحوم نے اس سلسلہ میں جو داؤ پیچ بتلائے اور جس صفائی سے لکڑی چلائی اور اس کی بندش کی وہ ہر اعتبار سے استادانہ تھی اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بنوٹ کے فن میں مرحوم طاق تھے۔

مرحوم کو مردانہ کھیل بہت پسند تھے، شکار کے بڑے شائق تھے۔ گولی بھی خاصی چلا لیتے تھے، شکار پارٹیوں میں اکثر شریک ہوتے اور شکار میں "چلائی" تو وہ ایسی کر لیتے تھے کہ نوجوان دنگ رہ جاتے تھے۔ غلیل چلانے کی بڑی اچھی مشق تھی۔ اس فن کے رموز سے خوب واقف تھے۔ غلیل دیکھ کر بتا دیتے تھے کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ کس زمانہ کی ہے اور کس کوٹھی کا بانس ہے۔ بانس کی چھڑی بہت پسند کرتے تھے۔ بانس پہچاننے کا عجیب ملکہ تھا کسی کے ہاتھ میں اس قسم کی چھڑی یا ڈنڈا پا لیتے تو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بڑے شوق سے دیکھتے جاتے اور بتاتے کہ بانس کی چھڑی کس طرح بنائی سدھاری جاتی ہے۔ اس کی گرہیں کیسے بنائی جاتی ہیں کیسے اس پر رنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ کس طرح پختہ کرتے ہیں۔ اور کیا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

ایک بار اُبھرے ہوئے حروف (ریلیف) کی چھپائی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں اس قسم کی چیز رائج تھی اس وقت مشین تو تھی نہیں لوگ ناخن سے اس طرح کی چیز بنا لیتے تھے اور یہ بھی ایک طرح کا فن تصوّر کیا جاتا تھا۔ پھر فرمایا اب مشقت تو رہی

نہیں لیکن کوشش کرتا ہوں شاید کچھ ہو جائے اس کے بعد ایک معمولی سے کاغذ کے پرزے کو چٹکیوں کی گرفت میں لے کر اوپر تلے کچھ اس طرح ناخن سے کچوکے دیئے کہ تھوڑی ہی دیر میں چند حروف ابھر آئے جو بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی ڈائی سے ابھرے ہوئے حروف چھاپ دیئے گئے ہیں۔ فرمایا: جب مشق تھی تو پوری عبارت لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک دن بھی ملاقات نہ ہوتی تو پوچھتے کہاں تھے کیسے ہو مسکرا کر محبت اور دوستی کے لہجہ میں شفقت کے انداز سے دوستوں کے بارہ میں لطف و مرحمت کا کوئی جملہ کہتے کوئی ایسی بات ضرور کہتے جس سے مجھے اپنی فرزانگی یا شرافت کا احساس ہوتا۔ زمانہ و زندگی کی عارضی یا مسلسل مکروہات یا سیرت کے بعض داغ دھبے دھل جانے یا مدھم پڑ جانے اور محسوس ہونے لگتا کہ شرافت و اولوالعزمی خلق و مرحمت دنیا کی بڑی چیزیں اور زندگی کی بڑی آسودگیاں ہیں۔

میرا پرانا مکان مرحوم کے مکان سے بالکل قریب تھا۔ ممتاز ہاؤس کے پورب میں ایک بڑا میدان ہے اس میں ہو کر مولانا کالج اور مسجد جاتے مئی جون کی علی گڑھ کی گرمی دیں جب آگ برستی ہوتی اور گرد و غبار سے فضا تیرہ و تار ہوتی۔ مولانا ظہر کی نماز پڑھانے اس میدان سے گزرتے اسی پابندی وقت سے جیسے گھڑی چلتی ہے بالکل جیسے کوئی مجاہد میدانِ جنگ میں جاتا ہے۔ نہایت ہی ادنےٰ قسم کی کھدر کی عبا کھدر کی صدری

کھدر ہی کا لمبا کرتہ اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ ایک لمبا سا رومال کاندھے پر۔ موسم کی شدت ہوئی اس سے گلا اور کان چھپائے ہوئے سر پر عمامہ پاؤں میں سرخ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا پنجابی وضع کا جوتا۔

مولانا کی عمر غالباً ۵۵ سال کی ہوگی جسم وجسامت کے اعتبار سے ممتاز نہ تھے۔ بال کافی سفید ہو چکے تھے لیکن طبیعت ایسی مردانہ پائی تھی کہ ان کے کسی فعل سے کبھی یہ نہ محسوس ہوا کہ مولانا کی رفتار و گفتار یا کردار میں تھکن کا کوئی شائبہ بھی تھا۔ منزلیں طے کرتے پیدل آئے ہیں اور اپنے لمبے رومال سے پاؤں کی گرد طاقت و اعتماد سے جھاڑ کر کرسی مونڈھا یا چارپائی پر بیٹھ گئے۔ نہ زبان سے کوئی ایسا فقرہ کہیں اور نہ تیور سے اس کا پتہ لگے گا کہ تھکان غالب ہے اسی طور پر جب اُٹھ کھڑے ہوتے تو نہ بوڑھیوں کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھ کر کسلمند ہو کر آہ کر کے کھڑے ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے تازہ دم اُٹھ رہے ہیں۔

ان کا ڈھیلا ڈھالا کھدر کا لباس سپاہیانہ عمامہ ہاتھ میں ڈنڈا، قدم لمبے اور ہموار جیسے کوئی قواعد پریڈ کر رہا ہو۔ کوئی واقعہ ہو کسی حال میں ہوں یہ ناممکن تھا کہ قدم کی لمبائی میں ایک انچ کی کمی بیشی ہو جائے یا رفتار میں جھول آجائے مسجد جا رہے ہوں کلاس پڑھا کر نکلے ہوں۔ دوستوں کے ساتھ ہوں یا جنازہ کے ہمراہ، اس مستعدی سے بڑھتے تھے جیسے ہر بات میں ہر شخص سے سبقت کرنا چاہتے ہیں خوشی ہو یا غمی لب ولہجہ کے مردانہ پن میں فرق نہیں آنے پاتا تھا۔ کوئی محفل ہو

کسی شخص کا سامنا ہو مرحوم کہیں جھکتے نہیں تھے۔ بڑے سے بڑا آدمی ہو، ہمیشہ گفتگو اس طور پر کرتے جیسے کسی اپنے برابر کے آدمی سے مل رہے ہیں۔ لہجہ میں استواری، بات میں صفائی، چہرہ پر مردانگی انداز میں شگفتہ سنجیدگی۔ آتے تو لوگ خوش ہو جاتے، جاتے تو بڑی خوش آیند فضا چھوڑ جاتے۔

میرے مکان کا صدر دروازہ بالعموم کھلا رہتا تھا۔ مرحوم کا معمول تھا کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے۔ کوئی مہمان ہوا تو اس سے تھوڑی دیر تک گفتگو کی، میں آگیا تو خیر ورنہ اطلاع کبھی نہ کرائی۔ اندر بچے سن پاتے کہ مولانا تشریف لائے ہیں۔ تو بھاگ کر باہر آتے، مولانا بھی اسی انتظار میں ہوتے دور ہی سے کہتے بھاگ آ بھاگ آ اور عبا میں چھپ جا۔ میں آتا تو پوچھتے بتاؤ منی کہاں گئی میں کہتا معلوم نہیں البتہ آپ کے عبا کے نیچے دو پاؤں نظر آ رہے ہیں۔ کہتے ارے وہ تو چلی گئی اپنے پاؤں چھوڑ گئی۔ یہ کہتے اور اس کا پاؤں عبا ہی سے ڈھک لیتے۔ جاتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ میدان سے گزر رہے ہیں، بچوں نے دیکھ پایا سب کے سب شور مچاتے پہنچ جاتے اور کہتے عبا میں چھپا لیجئے مولانا کتنے ہی ضروری کام سے جاتے ہوں فوراً ٹھہر جاتے۔ ہر چہار طرف طلبا اور لوگ آتے جاتے ہوتے مولانا ان بچوں کی فرمائش کو پورا کرتے اور آیندگان و روندگان سے پوچھتے بتاؤ فلاں بچہ کہاں ہے۔ لوگ بھی ٹھہر جاتے

اور مولانا کی اس تفریح کا تماشہ دیکھتے۔ کئی بچے ہوتے اور عبا میں جگہ نہ ملتی تو کسی کو ڈنڈا دے دیتے کہ اسے گھوڑا بنا کر دوڑا۔ ورنہ کاندھے سے رومال اُتار کر اس پر ڈال دیتے اور اُسے بھی چھپا لیتے۔

جاڑے میں کھدر کی پوری آستین کا شلوکا پہنتے اور نہایت معمولی داموں کا کمل نما کپڑا عبا کی شکل میں استعمال کرتے۔ صرف گرمیوں میں اکثر بلبے کرتے پر ایک صدری استعمال کرتے لیکن ایسا لباس صرف اپنے گھر پر یا بے تکلف دوستوں کے ہاں جاتے وقت استعمال کرتے۔ ڈنڈا اور عمامہ البتہ کبھی نہیں ترک کیا۔ ڈنڈے کے سہارے کبھی نہیں چلتے بلکہ اسے اس انداز سے لے کر چلتے تھے گویا سہارا مقصود نہ تھا بلکہ اس سے اظہار اعتماد و افتخار تھا۔

چندہ دینے، سائل کی امداد کرنے اور اچھی چیزیں خریدنے کا بہت شوق تھا، روپے پیسے کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ لیکن موقع آن پڑتا تھا تو اپنی بساط سے زیادہ صرف کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کسی قدر آزردہ ہو کر مرحوم سے کہا کہ آخر آپ اس قدر شاہ خرچی پر کیوں اُتر آتے ہیں۔ مولانا مسکرائے فرمانے لگے، بھائی دیکھو تو کوئی مانگتا ہے جبھی تو دیتا ہوں یوں تو پھینکتا نہیں پھرتا۔ میں نے عرض کیا آپ کی اس کمزوری سے لوگ واقف ہو گئے ہیں اس لیے بے تکلف مانگ بیٹھتے ہیں کہنے لگے اچھا سنو ایک عرب کا قصہ تم کو سناؤں۔

ایک عرب کی ملاقات اپنے جانی دشمن سے ہو گئی، عرب کے پاس

نہایت اچھی تلوار تھی، دشمن نے تلوار ہی کی فرمائش کر دی۔ عرب نے بغیر کسی تکلف کے تلوار حوالے کر دی۔ بات آئی گئی ہوئی، کسی دوست نے عرب سے کہا کہ یہ حماقت کیوں کی، تم تو نہتے ہو گئے تھے اگر دشمن نے حملہ کر دیا ہوتا تو کیا کرتے، اُس نے کہا ٹھیک کہتے ہو اتنی سی بات میں بھی سمجھتا تھا لیکن اس کو کیا کروں جب وہ مانگ بیٹھا تو میں کیسے نہ دیتا۔ غور تو کرو وہ مانگ بیٹھا!!

میں نے کم لوگوں کو مولانا جیسا کنبہ پرور اور مہمان نواز پایا۔ ان کا گھر ہر طرح کے مہمانوں عزیزوں اور تو داروں سے بھرا رہتا۔ میں نے آج تک نہ دیکھا کہ مولانا کے ہاں دو چار اجنبی نہ موجود ہوں۔ جو کھاتے وہ سب کو کھلاتے چائے، کھانا، فواکہات، غرض اس قسم کی تمام باتیں سب کے ساتھ باہر مردانہ میں ہوتیں۔ یہ مرحوم کے خاندانی روایات میں سے تھا۔ وطن میں بھی مولانا کا گھر ہر طرح کے لوگوں کا ماویٰ و ملجا تھا جس کا جی چاہے چلا آئے گھر والوں کی طرح رہے سہے، کوئی نہ پوچھے گا کہ آپ کون ہیں، کیسے آئے، کب تک رہیئے گا، اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا، جو خاندان کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس سے کوئی تکلف نہ برتا جائے گا۔ اس کا جی چاہے تو وہ ہر صحبت میں ہر گفتگو میں بلا تکلف شریک ہو۔ بالکل یہی نقشہ علی گڑھ میں پندرہ سال تک رہا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ علی گڑھ کے ایک بڑے صاحب اقتدار بزرگ مولانا کے ہاں اتفاقاً آ گئے۔ سہ پہر کی چائے ہو رہی تھی

مجمع دیکھ کر وہ جھجکے اور دریافت کیا کہ کس کا "ایٹ ہوم" ہے مولانا بھی
مجمع ہی میں ملے جُلے ایک طرف بیٹھے تھے بولے آجائیے آجائیے یہاں
ہر شخص ایٹ ہوم ہے۔ ان بزرگ کو اب تک اس پہ تعجب ہے کہ ایک
مولوی جس کی آمدنی یا تنخواہ بالکل معمولی تھی اتنا شاہ خرچ کیسے ہو سکتا
ہے۔

مرحوم کو چائے کا بہت شوق تھا۔ تکلف اور اہتمام سے چائے
پیتے تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے ملحق اپنے دفتر کے کمرہ میں کچھ دیر
قیام فرماتے۔ مرحوم کے احباب اور معتقدین بھی آجاتے، چائے کا دور
ہوتا، سب لوگ لطف و اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے اور مرحوم کی
سنجیدہ پُر خلوص اور شگفتہ باتوں کے مزے لیتے۔ یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔
اُس حلقہ میں بیٹھنے والے اس بات کا فخر و مسرت کے ساتھ اظہار کرتے
کہ نمازِ جمعہ کے بعد مولانا کے ہاں بیٹھے، چائے پی اور گفتگو کی۔

رمضان شریف میں جب مرحوم مسجد میں معتکف ہوتے تو بھی یہ ایک
خاص بات سمجھی جاتی کہ مولانا سے اعتکاف میں ملاقات ہوئی۔ ہمکلامی و
ہم نشینی کا یہ وقت اتنا اچھا گزرتا تھا کہ لوگ اس کو دن کا بہت اچھا
واقعہ خیال کرتے تھے۔ مسجد کے شمالی سرے کی آخری محراب میں مولانا
معتکف ہوتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں کہیں ملنے ملانے جا نہیں
سکتے تھے۔ اس لیے ہر شخص کو اپنے اپنے معمولات میں خلا سا محسوس
ہوتا۔ تو بالالتزام مولانا سے ملنے مسجد میں جاتا۔ ہر شخص سے اس کے

مذاق کی گفتگو کرتے، عطر پیش کرتے، دو چار باتیں ہنسی کی بھی کرتے
اور ایسا ظاہر کرتے کہ نہ روزہ کی کوئی تکلیف ہے اور نہ اعتکاف
کی پابندی گراں ہے۔ بلکہ ان دونوں کو وہ ایک ایسا رنگ دے
دیتے تھے کہ یہی چیزیں خوش آیند معلوم ہونے لگتیں اور لوگ مولانا
کے ہاں جانا اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے جیسے سیر و تفریح کے لیے جانا،
یہ مولانا کی سیرت کا عجیب پہلو تھا۔ کہ اُن کے معمولات دوسروں
کے لیے "ادارہ" بن جاتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد مولانا کا اپنے
دفتر میں ٹھہرنا اور چائے پینا یا اعتکاف میں بیٹھنا مولانا کے معمولات
میں سے تھا۔ لیکن دوسروں کے لیے یہی صحبت ایک معاشرتی ادارہ کی
صورت اختیار کر لیتی تھی اور جب تک یہ لوگ اس حلقہ میں بیٹھ نہ لیتے
تھے ان کے روزانہ پروگرام کی تکمیل نہ ہوتی تھی۔

موسم سے مرحوم کبھی متاثر نہ ہوئے۔ پنج وقتہ نماز مسجد میں پڑھی
اور پڑھائی جاڑوں میں فجر کی نماز اوّل وقت مسجد میں جا کر پڑھانا کوئی
معمولی بات نہیں ہے۔ مغرب کی نماز پڑھا کر دستوں میں آ بیٹھتے اور
عشا کے وقت رخصت ہو جاتے۔ اکثر ہم لوگ مولانا سے عرض کرتے مولانا
کہاں جائیے گا، آج تو منشی جی ہی کو امامت کا افتخار حاصل کرنے دیجیے
کہتے نہیں بھائی منشی جی کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگ گھبراتے ہیں طلبا
کا سابقہ ایسے سے نہ ہونا چاہیے۔ تم لوگوں کا جی چاہے تو بیٹھے رہو میں
نماز کے بعد آ جاؤں گا۔ اکثر منشی جی کو نماز پڑھانے کا موقع دے دیتے

یہ محض ہم لوگوں کا دل رکھ لینے کے لیے ہوتا۔

اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ مولانا کسل محسوس کر رہے ہیں۔ یا بڑے لطف کی گفتگو ہو رہی ہے یا کسی کام میں بڑے انہماک سے مشغول ہیں۔ کہ نماز کا وقت آ گیا۔ مولانا چاق ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور نماز پڑھانے چل دیں گے۔ اس طور پر جیسے ان میں نئے سر سے توانائی پیدا ہو گئی یا کوئی بڑا خوشگوار فرض یاد آ گیا۔ لطف یہ کہ ایسے مواقع پر وہ کسی کو ضغطہ میں نہ ڈالتے اور یہ محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ تو نماز پڑھانے جا رہے ہیں۔ اور لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ بعضوں کا وتیرہ ہوتا ہے۔ یعنی کوئی شرعی فرض بھی بجا لائیں گے تو اس طور پر کہ دوسروں کو نہ جائے فرار ملے نہ جائے عافیت۔

ایسے لوگ ہم میں آپ میں اکثر ملیں گے جو فریضۂ مذہبی ادا کرنے کے لیے اس طور پر تیار ہوتے ہیں گویا ان کا عبادتِ الٰہی کے لیے آمادہ ہونا ہی دوسروں پر عذابِ الٰہی نازل ہونے کا موجب ہو گا۔ عبادتِ الٰہی یہ ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کی عبادت کو اپنی تحمید و تسبیح نہ سمجھے بلکہ غافلوں کے خلاف مقدس جنگ سمجھ لے اور اسی اعتبار سے ان کو جزا اور دوسروں کو سزا دے۔ یہ جنت میں "سرکاری گواہ" بن کر جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

مولانا مرحوم ایسے نہ تھے انھوں نے مذہب کو ڈرانے دھمکانے یا فخر و پندار کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ہم لوگ کبھی کبھی دینی یا دنیوی امور

میں خوش طبعی یا سہل انگاری کو دخل دیتے جانتے۔ تو مولانا ہنس کر بڑے لطف و مرحمت سے فرماتے "ابے بس کر بھائی بس کر۔ بڑا اشریر ہے اس سے جان بچانی مشکل ہے"۔ لیکن ہم جو کچھ کرتے وہ اس بنا پر ہوتا کہ مولانا ہم کو اور ہم مولانا کو عزیز تھے وہ جانتے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔

مولانا ہم کو ناظم دینیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے عزیز تھے اور مولانا بھی ہم لوگوں کو انسان ہی سمجھتے تھے۔ اور یہی وہ رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو ایک جان و دو قالب بنا رکھا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہہ گئے میاں دوسرے مذاہب عقائد پر زور دیتے ہیں۔ اسلام اخلاق و اعمال پر نظر رکھتا ہے مسلمان کا ہر فعل گناہ ہے یا ثواب اس کے بعد جاؤ جو جی چاہے کرو۔

یونیورسٹی کے قانون کے ماتحت نماز نہ ادا کرنے کا جرمانہ ہوتا ہے جن طلبا پر جرمانہ کی سزا عائد کی جاتی وہ معاف کرانے کے لیے مولانا کے پاس آتے ان سے مولانا بڑے لطف و شفقت سے پیش آتے نہ جھڑکتے نہ گھڑکتے اور نہ ان کو شرمندہ کرتے باتوں باتوں میں نماز نہ پڑھنے کے وجوہ دریافت کرتے پھر کہتے میاں تمہارا یہ زمانہ بے فکری اور آزادی کا بھی ہے۔ اور پابندی و ریاضت کا بھی۔ بڑے ہو گئے تو اس زمانہ کی فراغتوں یا غفلتوں کو یاد کر کے مسرور یا ملول ہو گے۔ اس لیے موجودہ زمانہ کو غفلت میں مت گنواؤ اس وقت دکھ درد میں اپنے ماں باپ یا سرپرستوں

سے تقویت حاصل کرتے ہو۔ جب بڑے ہو گے تو ماں باپ یا سرپرست کوئی نہ ہوگا اُس وقت بھی سہارے کی ضرورت ہوگی۔ وہ ایسا وقت ہوگا جب اس سہولت سے تم کو سہارا نہ ملے گا۔ جو اس وقت میسّر ہے۔ اس لیے اسی وقت سے خدا کا سہارا ڈھونڈو تاکہ موقع پر پچھتاوا نہ ہو۔ جاؤ جرمانہ معاف کیا جاتا ہے۔

کلہ کا سرطان موت کا بہانہ بنا۔ ڈیڑھ دو سال سب کچھ کیا گیا لیکن ہوا وہی جس کا یقین تھا۔ ایسا یقین جو ٹالنے بہلانے کی حدود سے باہر ہو چکا تھا۔ کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی گئی۔ ڈاکٹر، حکیم، وید، سیانے دوانے سبھی سے رجوع کیا گیا مرض میں تھوڑا بہت تغیر ہو جاتا تھا۔ لیکن قابلِ اطمینان صورت کبھی نہ ہوئی لاعلاج مرض اور محبوب مریض کی مسلسل تیمارداری دوا دوش زیر باری اور ہر دم کا یہ احساس کہ اندوہناک انجام قریب تر آتا جا رہا ہے کیسا مستقل ذہنی کرب ہوتا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا اس سے سابقہ ہوا اور خدا نہ کرے کسی کو ایسا سابقہ ہو

لیکن مرحوم تھے کہ اپنی جگہ پر تنہا کھڑے تھے جیسے کوئی مجاہد تنہا دشمنوں کے سامنے ہو۔ تلوار ٹوٹ چکی ہو۔ زخموں سے جسم پاش پاش ہو پیچھے دیوار ہو سورج ڈوبنے والا ہو اور موت کے پرندے دم بدم بڑھنے والی فوج ہو اور نہ یہ کہ تاریکی میں چیخ چیخ اور جھپٹ جھپٹ کر ایک اندھیرے کا راستہ کاٹ رہے ہوں دل میں خدا جانے جذبات کے کیسے کیسے مدّوجزر اُبھرتے مٹتے رہے ہوں گے لیکن لبوں پر شگفتگی آواز میں

اُمید و استقامت اور آنکھوں میں روشنی جھلکتی رہی، ہراس و نا اُمیدی کا کوئی اثر نہیں، تیمارداروں کو تھکنے ملنے والوں کو تسکین دیتے نہ کراہے نہ بیزار ہوئے نہ اپنی تکلیف کا خود اظہار کیا۔ نہ دوسروں سے اس کا تذکرہ کیا۔ پگھل گئے لیکن ہلے نہیں۔

رخسارہ میں سوراخ ہو گیا تھا۔ دانتوں سے کچھ چبا نہیں سکتے تھے صرف رقیق غذا پر مدار تھا۔ وہ بھی کس مصیبت سے فرو کی جاتی تھی۔ ایک دن میں موجود تھا دُودھ پینے کی کوشش کر رہے تھے جو بار بار رخسارہ کے سوراخ سے نکل جاتا تھا۔ کبھی ناک میں چڑھ جاتا کبھی چھینک یا کھانسی آنے لگتی تھی۔ کپڑا تر بتر ہو رہا تھا۔ میری طبیعت بھر آئی۔ لیکن مرحوم کے مُنہ سے کوئی کلمہ مایوسی یا بیزاری کا نہ نکلا اور نہ تھکنے ہارنے کا اظہار کیا مشکل سے دو چار تولے دُودھ کے فرو ہوئے ہوں گے لیکن مرحوم نے پیالہ اس انداز سے واپس کیا جیسے خوب آسودہ ہو چکے ہیں یہ صرف تیمارداروں کی دلدہی کے لیے تھا۔ ہاں یاد آیا اتنا ضرور فرمایا "یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے"۔

گزشتہ عید میں اس قابل نہیں رہے تھے کہ مسجد میں جا سکتے چنانچہ مردانہ میں چارپائی پر دھوپ میں لیٹے سامنے تینوں طرف کرسی اور مونڈھے دُور دُور تک بچھا دیئے گئے۔ ملنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ جو آتا مولانا کی تکلیف اور معذوری کا خیال کر کے سلام کر کے دُور ہی بیٹھ جانا چاہتا۔ مولانا اُسے اپنے پاس بُلانے مصافحہ کے لیے خود ہاتھ بڑھاتے، ان کی گرفتہ

میں اب بھی توانائی تھی - پاس سے عطر اُٹھا کر دیتے - اس وقت تک گفتگو کر لیتے تھے - ہر آنے والے کا خیر مقدم آنکھوں کی پُر معنی و پُر مسرت جنبش سے کرتے - لطف کے بھی دو چار کلمے کہتے گھر سے کوئی بچہ آ نکلتا تو اُسے اپنے پاس بلاتے اُس کی آرائش و زیبائش کی خاص انداز سے داد دیتے خوش دلی اور خوش فعلی کا اظہار کرتے اور اس کو کسی طرح یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ خود کس اذیت میں مبتلا ہیں -

مرحوم کا معمول تھا کہ عید و بقر عید کی نماز شروع ہونے سے ذرا پہلے جگہ جگہ کھڑے ہو کر تکبیروں کی تعداد اور قیام و قعدہ کے طریق بتاتے تھے - ان کا ایک فقرہ اب بھی یاد آتا ہے "..... بدوں ہاتھ باندھے رکوع میں چلے جائیے، ہر شخص سے معانقہ کرتے - ہزاروں آدمیوں سے گلے ملنا اور خوش دلی کا دامن نہ چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے مسکرا کر آزادی اور شفقت سے گلے ملتے، ملنے میں کسی کو کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ کسی سن رسیدہ سنجیدہ متقشف، یا متبحر عالم دین یا صرف مولوی سے مل رہا ہے بلکہ ہر شخص یہ سمجھ کر ملتا اور ملنے کے بعد محسوس کرتا کہ وہ ایک اچھے آدمی اور مخلص و خوش باش دوست سے مل رہا ہے یا مل چکا ہے گذشتہ ہی عید کا موقع تھا حاضرین میں سے کسی صاحب نے کہا مولانا آج عید میں آپ کو نہ دیکھ کر طبیعت بہت اداس ہوئی مسکرا کر فرمایا انشاء اللہ آئندہ عید میں اس کا موقع ملے گا اس حالت میں بہت کم لوگ اس طرح کا فقرہ بے ساختگی سے کہہ سکتے ہیں -

مولانا کے قویٰ اتنے اچھے اور ان کا مزاج طبعی اتنا صحیح کہ مرض اپنے شدائد کے آخری حدود تک پہنچ گیا۔ لیکن مرحوم کو عوارض متعلقہ میں سے کسی کا سامنا نہ ہوا کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی خلش نہیں پیدا ہوئی۔ مدتوں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے رہے اور اس دم خم کے ساتھ کہ کسی کو اصل مرض کا علم بھی ہو تو وہ صرف یہ اندازہ کرسکتا کہ کوئی معمولی سا چھوٹا پھنسی ہے جس پر پٹی بندھی ہوئی ہے اس عمر اور اس مرض میں نظام جسمانی کا ایسا توازن اور قوت ارادی کی یہ پختگی حیرت انگیز ہے۔

جب تک بالکل ہی صاحب فراش نہ ہوگئے، فرائض متعلقہ پابندی اور تندہی سے بجا لاتے رہے ایک بار پرو وائس چانسلر صاحب مولانا کو دیکھنے گئے۔ مرض شدت پر تھا۔ گفتگو مشکل سے کرسکتے تھے زنان خانہ میں ملاقات ہوئی۔ پرو وائس چانسلر صاحب نے چاہا کہ کچھ تسکین اور ہمدردی کے الفاظ کہیں، مولانا نے سبقت کی اور مسجد کے جنوبی سلسلۂ عمارات میں ترمیم کا نقشہ پیش کیا اسی دوران میں مسجد کے بعض دیگر انتظامی مسائل بھی چھیڑ دیئے اور اس اعتماد سے گفتگو کی جیسے کوئی شخص تندرستی کی حالت میں اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایسا ہو گیا تو اس کے کارناموں میں بڑا اضافہ ہوجائے گا۔ پرو وائس چانسلر صاحب چلنے لگے تو چند کلمات تسکین و ہمدردی کے کہے مرحوم نے ان کلمات کی قدر کی، لیکن اس طور پر بالکل نہیں جیسے ڈوبنے کو تنکے کا سہارا مل جائے۔ بلکہ اس بشاشت اور دلبری سے جیسے وہ کسی مصیبت میں مبتلا

ہی نہ تھے۔

مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم کے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک بڑی پامردی سے گئے۔ وہاں نماز جنازہ پڑھانے کا سوال اٹھا تو اس بنا پر معذوری کا اظہار کیا کہ رخسارہ کے زخم سے دم آتی تھی۔ لیکن ان کے بشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اس معذوری کا کیسا شدید صدمہ تھا۔ قبرستان سے واپس ہوتے ہوئے فرمایا اس آخری خدمت کے بجا لانے کا افسوس ہے۔ سردار اُٹھ گیا۔

اسٹریچی ہال میں کسی کی پذیرائی کی تقریب تھی۔ مرض کی ابتدائی حالت تھی لیکن تکلیف بہت تھی اس موقع پر مولانا کو جلسہ کے افتتاح کے سلسلہ میں کلام پاک کی تلاوت کرنی تھی۔ ہم سب نے عرض کیا کہ مولانا آپ تکلیف نہ فرمائیے کوئی اور تلاوت کرے گا۔ فرمایا نہیں کوئی مضائقہ نہیں ایسی بھی کیا تکلیف کہ کلام پاک کی چند آیات نہ تلاوت کرسکوں چنانچہ مولانا ٹھیک وقت پر اسٹریچی ہال پہنچے۔ سر اور رخسارہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرہ تکلیف سے تمتما یا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا تو اپنا ڈنڈا لیے ہوئے ڈائس پر پورے وقار اور مستعدی سے آئے۔ آواز میں کہیں تذلل یا تذبذب نہ تھا۔ چند آیتیں تلاوت فرمائیں اور براہِ راست مکان پر واپس آگئے۔

مرض بہت بڑھ چکا تھا۔ ایک دن شام قریب تھی سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ اتنے میں ہم سب کے بڑے دیرینہ شناسا ایک افغانی پٹھان آگئے

جو مشک زعفران، بعض ادویات، شال اور سمور وغیرہ کی گشتی تجارت کرتے تھے۔ حاضرین پر ایک طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خان کا غیر متوقع ایسی حالت میں آنا ہم لوگوں کو گراں گزرا لیکن مولانا نے اس ضغطہ کو بڑے لطف و ہمت کے ساتھ دور کیا۔ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا دیا مصافحہ کے بعد اشارہ سے مزاج پرسی کی۔ اور لمحہ بھر بعد لڑکھڑاتی آواز میں لیکن لطف کے ساتھ پوچھا کیوں خان ہمارے لیے کیا لائے، خان نے جواب دینے میں تامل کیا تو بولے زعفران اور مشک لائے ہو۔ خان نے کہا مولانا اللہ آپ کو شفا دے سب کچھ حاضر کرونگا۔ مرحوم نے بڑے شوق سے ساری چیزیں دیکھیں اور بہت کچھ خریدیں اسی لطف و شوق سے جیسا کہ تندرستی میں کیا کرتے تھے۔

مسلسل مصائب بالخصوص بیماری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں کو ابھار دیتی ہے آدمی زود رنج اور تنک مزاج ہو جاتا ہے صحت و عافیت میں جن لوگوں کی طبیعت متوازن ہوتی ہے مرض و مصیبت میں بالعموم یہ توازن قائم نہیں رہتا۔ میرا اور مولانا کا مسلسل دن رات کا پندرہ سال تک ساتھ رہا۔ میں نے ایک دن بھی یہ نہ دیکھا کہ مولانا کسی پہ برہم ہوئے ہوں یا زبان سے کوئی غیر ثقہ کلمہ نکلنے دیا ہو۔ بچوں پر، چھوٹوں پر، نوکروں پر، بعض نامعقول لوگوں پر، آدمی کبھی نہ کبھی غصہ کرتا ہی ہے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کبھی کسی حال میں آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ کم سے کم میں نے ان کو کبھی اس حال میں نہ دیکھا، ہمیشہ

سنجیدہ یا شگفتہ پائے گئے۔

اس مسلسل و مہلک بیماری میں وہ ہر مرحلہ سے گزرے۔ ہر طرح کی سختیاں جھیلیں، توقعات کے خلاف اس سلسلہ میں اُن کو مایوسی بھی ہوئی سخت زیر بار ہوئے بعض صدمے بھی اُٹھائے لیکن کوئی نا ملائم کلمہ کسی کے خلاف کبھی نہ نکالا۔ نیز سے بھی کبھی مایوسی یا بیزاری کا اظہار نہ کیا۔ ایک دن تکلیف زیادہ تھی۔ تھوڑی بہت گفتگو کر لینے پر قادر تھے۔ لیکن تکلیف کا ایسا غلبہ تھا کہ گفتگو کرنے کا یارا نہ تھا۔ اتفاق سے اُسی دن ایک معزز بزرگ ملنے تشریف لائے اور مولانا سے ہمدردی کی گفتگو شروع کر دی۔ مولانا نے فرمایا الحمد للہ اچھا ہوں۔ جواب میں یہ کلمہ ہمیشہ مولانا کی زبان سے نکلا، مزید گفتگو ہوئی تو فرمایا دیکھئے تو کتنی عمر پائی اور کس فراغت و عزت سے زندگی بسر ہوئی آخر کوئی وقت تو آنا جب یہ دور ختم ہوتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس حال میں ہوں۔ ممکن تھا کہ اس سے بھی بدتر حالت ہوتی۔

جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو زنان خانہ سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔ ملنے والے وہیں مل آیا کرتے۔ میں عرصہ سے دیکھنے نہیں گیا تھا۔ یہ میری نامعقول کمزوری ہے۔ میں ایسی حالت میں کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ آدمی بھیجکر بلوایا۔ اندر پہنچا تو تخلیہ تھا۔ میں نے ذرا دور بیٹھنا چاہا۔ اشارہ سے قریب بلایا۔ اب گفتگو کرنے میں بڑی دقت ہونے لگی تھی اس لیے خود میں نے کچھ نہ کہا۔ ہاتھ اور آنکھ کے اشارہ سے پوچھا کہاں تھے میں نے

عرض کیا مولانا بس یوں ہی نہیں آنا ہوا، خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا حالانکہ خیریت دریافت کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ کوئی اطمینان بخش خبر کبھی نہ ملی۔ اور نہ اُس کی توقع ہوتی لوگ جو کچھ آپس میں تذکرہ کرتے اسی پر اکتفا کر لیتا تھا اور چاہتا کہ یہ تذکرہ ختم ہو اور کوئی دوسری بات شروع ہو جائے۔ مرحوم تھوڑی دیر تک خاموش میری طرف دیکھتے رہے پھر بڑی کوشش سے اٹک اٹک کر نا صاف لفظوں میں فرمایا، پریشان نہ ہو، اللہ نے چاہا تو اچھا ہو جاؤں گا۔

اب مجھ سے نہ رہا گیا میں نے بے اختیار کہنا شروع کیا مولانا کیا کروں جو کچھ بس میں تھا سب کر دیکھا۔ اب کچھ بن نہیں پڑتی اپنے بس کی چیز تو روپیہ پیسہ، دوڑ دھوپ، محبت اور ماتم ہی ہے۔ یہ سب بیکار ثابت ہوئے اب تو صرف دیکھتے رہنا رہ گیا ہے۔ اس کی بھی ہمت نہیں رہی۔ مولانا بڑے غور سے سنتے رہے پھر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دیر تک پکڑے رہے۔ داہنا ہاتھ خالی تھا اسے اٹھایا اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا معلوم ہوا جیسے کوئی چیز گلوگیر ہے حلقے سے کھانس کر گلہ صاف کیا اور بولے "وہ دیکھ رہا ہے"۔

میں چلا آیا۔ یہ آخری ملاقات تھی، تعطیلوں میں میں پہاڑ پر چلا گیا۔ جس رات کو روانہ ہونے والا تھا۔ طبیعت کا عجیب حال تھا۔ جی چاہتا تھا کہ مولانا کو آخری بار دیکھ آؤں اس لیے کہ سمجھتا تھا کہ اب دائمی مفارقت کی ساعت دور نہیں ہے۔ دوسری طرف اپنے میں اس کی

سکت نہ پاتا تھا۔ کہ یادداشت کی اس آخری نقش کی کسک کبھی دل سے محو کی جا سکے گی۔ دیر تک اسی حیص بیص میں رہا۔ بالآخر اس فیصلہ پر پہنچا کہ سلام کر ہی آؤں۔ وہاں پہنچا تو در و دیوار اور وہ تمام چیزیں اشخاص اور یادگاریں ایک غمناک ہجوم میں بڑھتی پھیلتی دل و ذہن پر چھا گئیں جن سے سالہا سال سے سابقہ تھا۔ ہمت چھوٹ گئی اور سلام کئے بغیر لوٹ آیا۔ تعطیلوں بعد واپس ہوا۔ تو مرحوم اپنے وطن جا چکے تھے اور وہیں سے مقررہ وقت پر نہ ایک ساعت اِدھر نہ ایک ساعت اُدھر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

مرحوم اصغر گونڈوی

انداز ہیں جذب اس میں سب شمعِ شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکسترِ پروانہ

دنیا کی بھلی یا بری باتیں دنیا کے بھلے یا برے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں اسی طرح آتی ہیں۔ ماں باپ، بھائی بہن، احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں کی محبت سے آئی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں۔ ممکن ہی نہیں یقین ہے دوسروں میں بھی ہوں گی۔ لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لیے زیادہ عزیز تھیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جن کی ذات سے ان کو

عزیز تر و گرامی تر بنا دیا تھا ۔

اصغر صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں مدرسۃ العلوم کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ مولانا اقبال احمد صاحب سہیل (علیگ) ہی کے توسّل سے ہوئی جنھوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی۔ اس وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے ناآشنا تھا۔ مولانا سہیل سے البتہ پرانی یاد اللہ تھی۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ مولانا اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پر تشریف لائے میں گھر میں تھا سہیل صاحب کی اطلاع ہوئی تو میں بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر ذمّہ دارانہ فقرے کچھ ادھورے کچھ پورے وردِ زبان کرتا آیا اس لیے کہ میں نے مولانا سہیل جیسا بے پناہ برجستہ گو اور دقیقہ سنج آدمی اب تک نہیں دیکھا وہ عالمانہ نکتوں اور مجلسی فقروں کو اس لطف کے ساتھ ایک دوسرے میں سموتے ہوئے برمحل و مسلسل چپت کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت عش عش کر جاتی ہے میں جانتا تھا کہ انھوں نے پہل کر دی تو ان کا قابو میں لانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے میں گھر سے تیار ہو کر نکلا تھا۔

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے کمرہ چھوٹا تھا دروازے بند اور روشنی مدّھم کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی

کے قد و قامت کے مقابلہ میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ بہ لحظہ سمٹتی جا رہی ہیں
دراز قد، متوسط جسم، ستھری و خوش قطع پوشاک، سر پہ پٹے، سڈول
بھری بھری فرینچ کٹ داڑھی سر پہ بالوں کی اونچی ٹوپی چہرہ پہ اجالا آنکھوں
میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی، تیور میں شرافت، متوسط عمر،
انداز میں خود اعتمادی و دل آسائی، بیک نظر دل نے گواہی دی کہ اچھے
آدمی سے ملاقات ہوئی یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا
آدمی بڑائی اور ملنساریت سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں
انداز کا جھکاؤ تھا۔ مسکرانا ایسا جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں
بلکہ تبسم ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ ان کا مسکرانا لب و دہن کا مسکرانا
نہ تھا بلکہ چہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے
میں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔ مولانا بولے، ملو ایک انسان
لایا ہوں میں نے کہا شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ
کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے ملو، ملو اصغر
صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل گیر ہو گئے اور میں نے کچھ ایسا
محسوس کیا جیسے محبت اور مرحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد
کر دیا ہو۔

مولانا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور لپٹے بندھے ہوئے
بستر پر بیٹھ گئے پاس ہی لوٹا تھا اسے اس طور پہ اٹھا لیا جیسے میرے

بالکل ایسے ہچکنے والے تھے۔ مجھ سے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی میں بیٹھنے کیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ بولے سنو اصغر صاحب کا ایک شعر سُناتا ہوں۔ ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی کہ بولے اصغر صاحب بس کسر یہ رہ گئی کہ ذاکر نہیں ہیں ورنہ دیکھتے کیا لطف آتا۔ پھر ایک خاص ترنم سے پیشہ وروں کے نہیں بلکہ بھلے مانسوں کے ترنم میں پڑھا ؎

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

مولانا سہیل شعر کے بڑے اچھے پارکھ ہیں۔ ذاکر صاحب اچھے شعر سُن کر نئی اور اچھوتی دُنیائیں بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں کسی میں نہیں لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر مجھے بھروسا نہیں ہوتا کیونکہ دُنیا میں سارا جھگڑا اسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوتا ہے۔

میں نے کہا مولانا شعر بڑے مزے کا ہے۔ للہ اسے بکس، بستر پر بیٹھ کر اور لوٹا ہاتھ میں لے کر غارت نہ کیجئے۔ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے، کھانا آیا مولانا نے فرمایا اصغر صاحب ذرا روح نشاط تو نکالیے، ان کو اشعار سنا دوں۔ میں نے عرض کیا مولانا ذرا چھری تلے دم لیجئے

دیکھیے جاڑا پڑ رہا ہے انگیٹھی آتی ہے۔ کھانا کھا کر چائے کا دور ہوگا۔ پھر جھوٹ سچ ملایا جائے گا۔ آپ تو اشعار کا بیوپار کرتے ہیں۔ اس سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی ہے آپ کا کیا نہ دنیا کے قابل نہ عقبیٰ کے قائل! مولانا ایک خاص انداز سے منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسے دونوں پاؤں گھٹنے سے موڑ کر کرسی پہ بیٹھے ہی بیٹھے جھولا جھولنے لگے۔ یہ مولانا کے ابتہاج و اہتزاز کی خاص علامت ہے۔

ناظرین معاف فرمائیں، ابتہاج، و اہتزاز ایسے الفاظ استعمال کرنے میں مجھے کبھی اور ضرور تامل ہوتا لیکن جب بھلے مانس اور سمجھدار موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں یا غیر مانوس ان کے برمحل و بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ جاہلوں اور لیڈروں کے اس دور میں دقیق یا نازک مفہوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے ادا کرنے کو تو ترس گیا۔ ابلہوں کو کون سمجھائے کہ صاحبِ ذوق عربی، فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تعصب کی بنا پر استعمال نہیں کرتے بلکہ مافی الضمیر کو آسانی سے منتج کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ عوام یا لیڈر کی سمجھ میں وہ لفظ نہ آئے تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ہم کب چاہتے ہیں کہ آپ نرے احمق اور جاہل بھی ہوں اور ہمارے جواہر پاروں سے کھیلنے بھی دیے جائیں۔

عوام کو خوش کرنا بڑے ثواب کی بات ہے۔ لیکن کوئی موقع تو ایسا

ملنا چاہیئے جب ہم اپنا اور اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں ۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آئے کہہ گزرنے کے ہیں ۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا اور نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم ۔ آواز دی اندر سے پان آ گئے انگیٹھی سرد ہونے لگی نوکر نے کوئلے ڈال دیئے نہ اندر سے کسی کے بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطرہ ۔ نیند آئی سو گئے ، جی چاہا بستر ہی پر رقص کرنے لگے ۔

مولانا سہیل نے فرمایا اچھا اصغر صاحب روحِ نشاط تو نکالیئے مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے آپ کو تو یونہی سب کچھ حفظ ہے میں نے کہا مولانا ذرا ٹھہریئے ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اُترا ہے مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا جلدی کیجئے ورنہ پھندا لگنے کا اندیشہ ہے ۔ میں نے کہا رند نے ظرف تو اُٹھا لیا لیکن ابھی ساغر بننا باقی ہے اس کے بعد پینے اور میخانہ بننے کا سوال آئے گا ۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اصغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں متاعِ یوسفی مسلّم لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں وہاں اصغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا میں بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں اصغر صاحب ہنس

پڑے، کہنے لگے رشید صاحب ساغر و میخانہ کی فضا شاعر نہیں پیدا کرتے کلال پیدا کرتے ہیں، شاعر تو شرافت و شہامت کا اعلان کرتا ہے مسجد میخانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا ہے علی گڑھ میں ساغر و میخانہ کی کیا کمی، کمی تو رندوں کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک فرمایا۔ لیکن یہ تو بتائیے مولانا سہیل کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے اُن کی نہ پوچھئے۔ تمام عمر میخانہ میں رہے۔ نکلے تو محتسب بن گئے ہیں۔ میں نے کہا محتسب ہی نہیں گواہ سرکاری بھی علی گڑھ سے نکل کر اُن کا یہ حشر ہوا نکالے گئے ہوتے تو یقیناً یہ نہ ہوتے۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاطِ روح کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا۔ کئی دن بعد مرحوم نے پوچھا آپ نے نشاطِ روح کا مطالعہ بھی کیا میں نے کہا اصغر صاحب اس وقت مولانا سہیل موجود نہیں ہیں۔ آپ خود کچھ متفرق اشعار سنائیے یہ شخص بلائے بے درماں ہیں شعر سے لطف اُٹھانے نہیں دیتا سوچنے کے چکر میں ڈال دیتا ہے وہ دیکھئے احاطہ کے پھاٹک پر کسی بزاخفش سے اُلجھا ہوا ہے۔ یقیناً اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہو۔ جو افلاطون و ارسطو سے کرنا چاہیئے تھیں۔ اصغر صاحب نے فرمایا متفرق اشعار نہ سناؤں گا۔ پوری غزل سنیئے۔ شاعر کو اسی طرح سننا چاہیئے۔ تصور سے ہم کنار ہو جیسے تصویر دیکھ کر کیا کیجئے گا۔ پھر یہ غزل سنائی۔ کیسا ترنم پُر تمکین و گوارا لہجہ تھا ـــــ

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی

گزر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے
جمالِ دوست و شبِ ماہ و بادۂ عنبی

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسمِ بلالی و طرزِ بو لہبی

سرشتِ عشق طلب اور حسنِ بے پایاں
حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیرِ لبی

کشمش نہ جامِ نگاریں کی پوچھ اے ساقی
جھلک رہا ہے سراب رنگِ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوئے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لالے پڑ گئے۔ لکھنؤ میڈیکل ہسپتال میں مدتوں صاحبِ فراش رہا۔ اس زمانہ میں اصغر صاحب الہ آباد میں تھے۔ تقریباً ہر اتوار کو میں ہسپتال کے بالاخانہ پر اپنے کمرہ کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو پاؤں کی ایک

خاص آہٹ سُنتا۔ دروازہ کھلتا، اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن
مستقل اور ہموار قدموں سے کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا
معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھ کر یا محسوس کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ السلام علیکم
اس لہجہ و انداز سے کرتے جیسے کوئی خوش خبری سُنا رہے ہیں کرسی
پر بیٹھ جاتے مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے کہ کیسا ہوں
یا کیا ہو رہا ہے۔ بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لیے
کوئی لمبا سفر کر کے نہیں آئے تھے بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لیے
آئے تھے میری طرف آ نکلے۔ باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دُور دُور
تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون شیطان کی آنت شائع ہوا تھا
میں نے ایک بار پوچھا اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتہ الہ آباد سے یہاں
کیوں آتے ہیں اور زحمت و زیر باری اُٹھاتے ہیں۔ کچھ سوچا پھر مسکرا
کر بولے شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے۔ میں نے کہا فرشتوں کو بھی!
فرمایا فرشتہ کو شیطان ہو جاتے بھی تو آپ نے سنا ہو گا! میں نے کہا
اصغر صاحب تکلیف نہ ہو تو کچھ سنائیے اصغر صاحب میری اس (غالباً
غیر متوقع) فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور ذیل کی غزل بڑے لطف
سے سنائی ؎

سرگرم تجلّی ہو اے جلوۂ جانانہ
اُڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بُت خانہ

یہ دین وہ دُنیا ہے یہ کعبہ وہ بُت خانہ
اک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ

قربان ترے مے کش ہاں اے نگہِ ساقی
تو صورتِ مستی ہے تو معنی مے خانہ

اب تک نہیں دیکھا ہے اُس کے رُخِ خنداں کو
اک تارِ شعاعی سے اُلجھا ہے جو پروانہ

مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمیِ حُسنِ شمع
اس سے بھی زیادہ ہے سوزِ غمِ پروانہ

زاہد کو تعجب ہے صوفی کو تحیّر ہے
صد رشکِ طریقت ہے یہ لغزشِ مستانہ

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا
یہ عشق وہ ہستی افسانہ ہے افسانہ

اندازِ ہیں جذب اس میں سب شمعِ شبستاں کے
اک حسن کی دُنیا ہے خاکسترِ پروانہ

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر واپس جاتے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہوئے ہے بلکہ یونہی باہر جا رہے ہیں۔ جب میں صحت یاب ہو کر واپس آ گیا تو ایک سال بعد کے بعد معلوم نہیں کس سلسلہ میں میں نے پوچھا کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی شگفتگی کیوں طاری رہتی ہیں نے آپ کو اخلاقاً بھی کبھی

فکرمند نہ پایا لیکیا میری ہمت افزائی مقصود تھی۔ بولے بالکل نہیں، اچھا سُنئیے ایک لطیفہ سُناتا ہوں۔

ایک دن میں ہندوستانی اکیڈیمی سے مکان واپس آرہا تھا۔۔۔ صاحب راستہ میں ملے اور نہایت غمناک لہجہ میں بولے اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے رشید صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ایسے تھے ویسے تھے میں سُنکر ہنس پڑا اور بولا حضرت حواس کی باتیں کیجئے انتقال کرنا کیسا۔ میں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہوکر رہیں گے انھوں نے مجھے بدحواس یا بیوقوف سمجھا اور لگے اپنی خبر کے موثق ذرائع بتانے گنانے، میں نے کہا یہ سب صحیح لیکن میں ہر ہفتہ دیکھ آتا ہوں ان کی پیشانی پر نہایت جلی نقوش میں "حیات" لکھی ہوئی ہے۔ وہ نہ مانے میں نے کہا آپ نہیں مانتے تو آئیے تار دے کر دریافت کرلیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور خبر غلط نکلی۔ رشید صاحب واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ پہنچکر آپ کو دیکھتا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش و تازگی کے ساتھ موجود ہے اور میں مسرور و مطمئن ہو جاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا انھیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے وہ کچھ عالم متبحر

نہ تھے لیکن اُردو کے بہت سے شعرا سے کہیں زیادہ ذی استعداد اور ذی علم تھے بڑی رسا طبیعت تھی نئے سے نئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی تہ تک اس سہولت اور صفائی سے پہنچ جاتے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس مرحلہ سے آن کا یہ سابقہ پہلی ہی بار پڑا تھا انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی اور نہ فنِ تنقید کے جدید ترین اصول سے آشنا تھے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے مشیرِ ادبی کی حیثیت سے ان اُمور سے سابقہ پڑا تو آپ کے قلم سے نہایت متوازن مستند و بے لوث تنقیدیں نکلیں اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اکثر اصل کا دھوکا ہوتا پکے مسلمان اور مشرقی تھے لیکن ہیں نے بڑے بڑے مغربیت مآبوں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معترف پایا اُردو میں عام نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریر میں زور، رنگینی اور وزن پیدا کرنے کے لیے حشو و زوائد سے کام نہیں لیتے تھے اُردو کے اکثر مستند اہلِ قلم بھی الف لیلےٰ کے یکبارہ سے ملتے جلتے ہیں۔ بات اتنی معمولی ہو گی کہ آپ سے نہ بھی کہیں تو حرج نہیں۔ لکھیں گے اس طرح جیسے دواؤں کا اشتہار لکھ رہے ہیں۔ ہمارو مارے ڈالتا ہے، یا محبوبہ بھاگ گئی ہے مرحوم تحریر و تقریر دونوں میں حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ انڈین پریس الہ آباد کی فرمائش پر انھوں نے "نخفون" کا ایک سلسلہ بچوں کے لیے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دل نشین انداز سے روشناس کرایا ہے۔ کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز

میں بھی علمی خدمات انجام دیں منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور رفیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف "اردو کی ذہنی تاریخ" شروع کی تھی کئی سو صفحات کا مسودہ اُن کے کاغذات میں اب تک موجود ہے لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈمڈ ہو گئے ہیں اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ اُن کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اصغر صاحب کی آمدنی بہت کم تھی لیکن میں نے اُن کو کبھی تنگدستی کا شاکی نہ پایا۔ اُجلا خرچ تھا۔ اچھا پہنتے تھے اس سے اچھا کھلاتے تھے اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔ اُن سے دس گُنی آمدنی والوں کو بھی میں نے اُن جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ اُن کے جسم پر یا گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ ہو سکتا کہ محض شوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا تیسرے درجہ کے بدل پر اکتفا کیا ہے اُن کی ہر چیز میں ذوق و سلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔ آج تک میلے اور پیوند لگے لباس میں نہیں دیکھے گئے۔ گفتگو میں رکیک یا کثیف فقرے زبان سے نہ نکلتے گفتگو آہستہ کرتے مسکرا کر کرتے لہجہ ہمیشہ نرم پُر وقار یا شگفتہ ہوتا۔ میں نے اُن کو کبھی مایوس، مضمحل یا مضطرب نہ پایا۔ اُن کے ملنے والے مختلف یا متضاد مشرب کے لوگ بھی تھے۔ لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی اور دوسرا بھی مایوس یا منقبض نہ ہوتا۔

الہ آباد میں پہلے پہل انھوں نے کٹرہ میں ایک مکان دوکانوں کے اوپر میں لب سڑک لے لیا تھا، بیٹھک میں براق چاندنی کا فرش، تین چار گاؤ تکیے، الماریوں پر روغن دیوار پر قلعی۔ میں ملنے گیا تو پوچھا، کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں البتہ ذرا شبہ ضرور ہوا کہ آپ کا مکان ہے یا حکیم اجمل خاں کا مطب۔ خدا کے لیے اس جگہ کو چھوڑ دیجیے۔ لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ ہو کہ یا تو مخصوص امراض کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں گھوڑے پر چوکا لگانے سے فائدہ، مجھے تعجب ہے آس پاس کے دوکانداروں نے آپ پر اب تک حملہ کیوں نہیں کر دیا۔ اگر جلد چھوڑنا ممکن نہ ہو، تو ہومیو پیتھک دوائیوں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیجیے۔ اصغر صاحب ہنس پڑے۔ فرمایا آپ نے بات تو ٹھیک کہی مجھے صفائی بہت پسند ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا تو بیک نظر یہ صفائی خود مجھے کھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اسے فوراً خریدتے، دوستوں کو دکھائی جاتی، کوئی پسند کر لیتا تو اسی کی نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور نقشے کی سینی لائے۔ راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے سینی دکھائی، پوچھا کہیے کیسی ہے، میں نے کہا عشوہ ہے عشوہ، فتوحات میں سے ہے یا خریدی ہے، بولے جی نہیں، فتوحات کا یہاں کہاں گزر میں نہ ملا نہ انگریز۔ خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے میں نے پوچھا کیا قیمت

دی۔ کہنے لگے واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے، سُنا نہیں۔ م

جو کچھ کہا کہ ترا حُسن ہو گیا محدود!

بس یہ آپ کی نذر ہے۔ وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آجاتی ہے تو اسے منگواتا ہوں۔ اسی میں کھانا منگوا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیز یاں غائب ہو چکی ہیں، نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ میں حافظہ کا کچا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو اگلے پچھلے زمانہ کے سیمیائی پردوں پر رنگ رنگ آہنگ، خد و خالِ رعنائی و زیبائی کیسے کیسے حزین و حسین نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں!

اصغر صاحب کھانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے۔ مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا۔ پہلا حملہ سہنے کو سہہ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں مشکل سے پڑتے۔ آخر آخر میں الہ آباد کے سینیٹ ہال کے سامنے بلویڈیر کے احاطہ میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا مکان کے احاطہ کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد پہنچنے کا وقت متعین تھا۔ میں نے ہمیشہ انتظار میں انھیں اس طویل سڑک پر ٹہلتے پایا اس میں کبھی فرق نہ آیا۔ پہلے چُست آڑا پاجامہ پہنتے تھے۔ بیماری کے بعد

سے غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا چینی آستینوں کا کرتہ، سر پر سپید ٹوپی ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ بٹوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار سگریٹوں کے ڈبے۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے قدم سنبھالے ٹہلتے رہتے۔ مجھے آتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہائے اُن کا باغ باغ ہونا! زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اترتی معلوم ہوتی۔ لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں شادمانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادہ یا اشارہ تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم ہوتے۔

اُن کی باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں کہتے، رشید صاحب سُنا، جب سے بیمار ہوا ہوں ذرا عیاش ہو گیا ہوں۔ ہر طرح کے پان مہیا کر فراہم رکھتا ہوں یہ دیکھئے ہر مارکہ کا سگریٹ ہے۔ ہر ایک کا رنگ جُدا ہے۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو مخصوص احباب کی صحبتوں میں آتا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے مکان پہنچتے، نوکر کو آواز دیتے ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لیجئے میں نے ہارلکس مالٹڈ ملک شروع کر دیا ہے۔ یہ اوولٹین کا گلاس ہے۔ یہ فورس ہے اور یہاں آپ نے کیونٹر کے مکھن کھلائے ہیں۔ ذرا یہ پولسن بھی ملاحظہ فرمائیے۔ غرض ہر چیز بڑے شوق و لطف سے پیش کرتے پھر کہتے ناشتہ کر لیجئے۔ وہ بھی حاضر کیا جائے گا۔ مدتوں سے بانگ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں آج اُسے

آپ دسترخوان پر چاروں شانے چت پائیں گے، یہ مرغ مسلّم کا عنوان تھا۔

اور یہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے آپ علی گڑھ کے پانوں کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔ آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ برقی قوام ہے وہ زعفرانی پتی ہے اور یہاں (نوکر کو آواز دے کر) ذرا وہ گولیاں تو لانا حکیم صاحب نے دی ہیں۔ کہتے تھے اُن کے مورثِ اعلیٰ نے شاہانِ اودھ کے لیے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا اس کا نام "آبروئے اودھ" ہے اسے ضرور چکھیے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن اس سے علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑے گا۔ کہنے لگے لیتے جائیے جس کی آبرو خطرہ میں دیکھیے گا دے دیجئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطف بیان میرے لیے تھا۔ جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں انہی کو المضاعف کر کے اور خود اوڑھ کر پیش کر رہے تھے اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے اُن کی اس حکمتِ عملی کو فاش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی امرودوں کی فصل ہوتی تو اُس کا ایک ٹوکرا ساتھ کر دیتے اور دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھیجنے تھے معلوم ہوا کہ وہ آجکل موجود نہیں ہیں زیادہ تو میں نے رکھ لیے اور کچھ آپ لیتے جائیے کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی تھوڑے انھیں بھی بھیج دیجئے گا۔

ایک بار متعلقین وطن سے علی گڑھ آ رہے تھے راستہ میں چند گھنٹوں کے لیے الہ آباد میں اصغر صاحب کے ہاں ٹھہر گئے میرا سب سے چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا مرحوم کو بچہ کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دوپہر میں اسے گود میں لیے سنبھلتے لڑکھڑاتے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں پہنچے اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھ کر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا سب کے سب دوڑ پڑے کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چارپائی پر مسلسل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کر دی تھی ہفتوں بعد چارپائی سے اٹھے تھے اس لیے بہت نحیف ہو گئے تھے۔ بہتیرا لوگوں نے سمجھایا اور نوکر نے مانگا۔ لیکن احمد کو اپنی گود سے نہ اتارا تھوڑی دیر بعد بچہ کو گود ہی میں لیے واپس ہوئے شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلتے رہے حتیٰ کہ دودھ پینے کے لیے ماں تک جانے نہ دیا۔

کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا۔ بولے رشید صاحب آپ تو دیکھ چکے ہیں (دوست کا بچہ) کتنا خوبصورت معصوم اور پیارا بچہ ہے آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بچوں سے مجھے کتنی الفت ہے اور اس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپ کے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے اسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ اول تو میں بھول گیا کہ بیمار و نحیف ہوں دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز پندار پیدا ہوا کہ احمد، بچوں سے

کہیں زیادہ دلکش اور پیارا ہے۔ ذرا میری بدحواسی تو دیکھئے میں نے بتّو
کے والدین سے بھی کہہ دیا کہ احمر نے بتّو کو زیر کر دیا۔ چنانچہ جس
فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر و مباہات
سے واپس آیا۔ احمر نے میری ایک کمی پوری کر دی۔

ایک بار خط آیا لکھا تھا "بلڈ پریشر اور احمر کی محبّت دونوں
بڑھ رہے ہیں دیکھئے کیا انجام ہو"

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے جب کبھی
الہ آباد جاتا تو وہ پتہ لگائے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی
ہوتا تو اس سے رسم و راہ پیدا کرتے مجھے لے جاتے اور گلاب پسند
کراتے ایک بار ایسے ہی ایک جگہ مجھے لے گئے، مالک سے زیادہ
خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے میں نے اخلاقاً
ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی۔ معاً اصغر صاحب نے
اسے حاصل کرنے کے لیے ڈورے ڈالنے شروع کئے میں نے موقع
نکال کر چپکے سے کہہ دیا۔ اصغر صاحب فکر نہ کیجئے سب کے سب معمولی درجہ
کے ہیں۔ مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ
آپ چُپ کیسے ہو گئے کہنے لگے کیا کہوں ان گلابوں کے نادر ہونے
اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سُنا تھا۔ گلابوں کے بارہ
میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا۔ نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھئے کمبخت
کسی طرح رام ہی نہ ہوتا تھا۔۔۔ صاحب (الہ آباد کے سب سے

مقتدر آبادی) کی معرفت اسے قابو میں کیا گیا - اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا - ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیونکر عمدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے -

---

مجھ میں ایک بد علوت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی روانہ ہوں گا - اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا - مرحوم کی آخری علالت کے زمانہ میں میرا جانا الہ آباد ہوا - صبح پہنچا شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا - مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں قیام کروں - ہزار ہزار طریقہ سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے - جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی ہرج نہ ہو گا - صبح چلے جائیے گا - میں ایسا بدبخت کہ نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا -

مجھے کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا میرے انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر ربخ پڑ گئی لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا تو پھر آپ کی خوشی - وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہو جاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں - میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے کس طور پر اور جس حالت میں

شکستہ خاطر کیا تھا اُس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمّت ہو سکے۔

چند ہی ایک روز کے اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی۔

دوسرے دن میں الہ آباد پہنچا۔ بلویڈ یر کار استہ سونا تھا طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبّت و مروّت کا وہ پیکر مجسّم ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبّت و شیفتگی سے اُس میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی برفستانی ہواؤں اور گورستانی سنّاٹوں کے سوا کچھ اور نہ تھا اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آئے گا اور کون اسے مسرّت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سناتا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا، سب سے پہلے اصغر صاحب کا ستائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا۔ میرے اچھے یا بُرے خیالات کا بیشتر حصّہ مضمون لکھنے کے دوران میں بے شان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو

اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دیں گے اور لکھو بہتر لکھو اور جلد لکھو کی اُمنگ پیدا ہوتی اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جن کے بارہ میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہہ تک لوگ نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں۔ اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا صاحب فکر ہوں۔ یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لیے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے۔ یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرا یہاں مطلب صرف اس شیفتگی سے ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و تصورات سے مرحوم کو تھی اور جس کا خفیف سے خفیف ارتعاش بھی اُن کے ذہن و دماغ پر مرتسم ہو جاتا۔

فالج کے حملہ کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا یہی حکم تھا۔ ورنہ وہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اس میں عجیب لطافتیں پیدا کر لی تھیں خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح رہتے تھے۔

ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے۔ اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو لیکن زندہ رہنے کے اور ہی گر ہیں زندہ رہنے میں ارادہ کو بہت بڑا دخل ہے۔ ہوش میں رہ کر تو میں مرونگا نہیں۔ البتہ بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے نبٹ لیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فالج کا شدید حملہ اور یک لخت حملہ ہوا اور چند گھنٹے مطلق بے خبری کے عالم میں رہ کر ہمیشگی میں مل گئے۔

اصغر صاحب زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرے تھے ہر قسم کی صحبتیں دیکھی تھیں لیکن انھوں نے خودداری اور بانکپن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شاعر ہونا اتفاقی تھا۔ وہ کچھ ہوتے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا۔ اوباش، قلندر، ارباب علم و فکر، صاحب باطن ارباب دل، بکراسی و بے بہرہ، طالب علم، کاروباری لوگ۔ میں نے ہر ایک کو ان کا قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنھوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بنایا۔

اصغر صاحب کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ جن کی قابلیت اور شخصیت مسلّم ہے وہ

بھی اصغر صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحروں یا فاتحوں میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رہیئے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں مرحوم تسخیر نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ خود ان کی الفت و اخلاص کی منزلت کرنا عزیز رکھتے تھے۔

ان میں ایک خاص نوعیت کی بڑائی تھی جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا پڑتا تھا!

جامعہ ملیہ میں ایک بار مشاعرہ تھا شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی۔ اصغر صاحب کی باری آئی مرحوم کی آواز طبعاً پست تھی شعر پڑھنے شروع کئے تو مجمع میں انتشار پیدا ہوا۔ مرشد (ذاکر صاحب) پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یک بیک اصغر صاحب سے پرچہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سنانے شروع کر دیئے، ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

ز لا تسخیر کردم این جہان مہر و انجم را
ز جوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

میں جانتا ہوں مرشد کا یہ اضطراری فعل کس راز کی غمازی کر رہا تھا۔ اور مرشد کے اضطراری فعل کا کیا درجہ ہوتا ہے ان کے چند ہی اضطراری آنسوؤں نے علی گڑھ کی آبرو رکھ لی اور جامعہ کو جامعہ بنا دیا اور مسلمانوں میں ایک نژاد نو کی طرح ڈالی۔

اصغر صاحب مشاعروں سے بیزار تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں کی دعوت رد کرنا گناہ ہے ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا

ہو گئی ہے لیکن یہ قصور ہمارا ہے۔ ہم میں نظر و فکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو سفینۂ نو کی متحمل ہو سکے۔

جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بے راہ روی سے کڑھتے تھے لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا بڑا پاس کرتے تھے۔ مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کر لو آنا تم کو نہیں پڑے گا۔ جگر صاحب ایسے غیور، عزت پسند، قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آئے جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا بہتر سمجھتے ہیں اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے پرانے زمانہ میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے باایں ہمہ جگر صاحب ایسا منہ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا۔ جاہ و شہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں اپنی اس افتادِ طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کر دیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مدتوں سے عالمِ ہوش میں ہیں۔ اور پچھلی عادت یک قلم ترک کر دی ہے میں نے ان کو انتہائی از خود رفتگی کے عالم میں دیکھا ہے اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کہتے سنا لیکن اصغر صاحب کا نام آتے ہی ان کو با ہوش ہوتے ہیں آتے دیکھا یا بے اختیار اشکبار پایا۔ اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے اور فخر

کرتے ہیں۔

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدین نے سخت نکتہ چینیاں کیں۔ مرحوم کی نظر سے یہ سارے مضامین گزرتے تھے لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے ناقدوں کو بُرا بھلا کہتے نہ سُنا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھ دار ہوں۔ خدا کا مفسّر شاعر ہے اور شاعر کا مفسّر نقاد ہوتا ہے یہ کڑیاں اُٹھ جائیں تو دنیا اختلال محض ہو کر رہ جائے ایک دفعہ انھوں نے فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتادِ طبع کا احتساب کئے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم ہونے لگتے ہیں۔ لوگ غزل سے بیزار ہیں۔ اس لیے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے حالانکہ اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ بُرے غزل گویوں نے کیا خرابیاں پھیلائیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اچھے غزل گو کتنی خوبیاں پیدا کر سکتے ہیں۔

مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں غزل کو مدِّ نظر رکھ کر شعر نہیں کہتا اس کو کیا کروں کہ بلند گہرے نازک اور لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں کاش میرے خیالات و احساسات کوئی دوسرا پیکر اختیار کر لیتے۔ مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلائیں۔

ایک دفعہ میں نے عرض کیا اصغر صاحب آپ تو جتنے اور جیسے شعر

چاہیں کہہ سکتے ہیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ غزل میں صرف اوّل درجے کے اشعار تو رہنے دیا کیجئے بقیہ کو حذف کر دیا کیجئے۔ اصغر صاحب پر ایک جھرجھری سی طاری ہوئی پہلو بدل کر بیٹھ گئے فرمایا رشید صاحب یہ آپ نے کیا بات کہی؟ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! شاعر کبھی دوسرے درجہ کی بات کہتا ہے؟ کہہ بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اوّل ہی درجے کے شعر کہتا ہے۔ سننے والے کے نزدیک وہ اوّل درجہ کا ہو یا دوم درجہ کا۔ اس سے شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو جب شاعر نے اسے کہہ دیا تو وہ بڑی ہو گئی۔ بہت بڑی کچھ دن اور گزریں تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہو جائے گی۔

اصغر صاحب کو سجّاد انصاری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا کہتے تھے زندگی نے وفا نہ کی ورنہ خدا جانے کیا ہوتے۔ فرمایا ہم میں ایسے نقاد اور مفکّر کی بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ اردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے جن کا تدارک نہ کیا جائے۔ تو ہونہاروں پہ زندگی تنگ ہو جائے۔ سجّاد بڑے بت شکن تھے کچھ دن اور جیتے ہوتے تو کیا معلوم توفیقِ الٰہی انھیں ابراہیم بنا دیتی۔

سہر تیج کا بڑا احترام کرتے تھے، کہتے تھے سہر تیج کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے اس لیے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمانے لگے۔ کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اتریں گے نہ حاضرین میں سے کسی

کو اس کی حدود سے گزرنے دیں گے۔ اُردو ہندی کے سلسلہ میں کہنے
لگے کہ ہندوستان میں سر تیج اور پنڈت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں۔ جن
کو اُردو سے بربنائے اُردو اُلفت ہے دونوں میں پرانے زمانہ کے
مسلمان شرفا جیسی وضع داری ملتی ہے۔ ایک بار ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو
آئی تو فرمایا ہندوستان میں سر تیج ہی ایسے شخص ہیں جو جماعتی تعصب سے
بلند ہیں۔ ہندوستان ایسے ملک کے لیے سر تیج ہی جیسے سردار کی ضرورت
ہے جب تک ہم ہندوستان کو ہندو مسلم روایات رواداری اور
خوش حالی کی علامت نہیں بلکہ ان کی ملکیت سمجھیں گے۔ ہندو مسلم
ہرگز متحد نہ ہوں گے۔ سر تیج اور دوسرے بے شمار لیڈروں میں یہی فرق
ہے۔

اونچی جماعتوں کے مختلف الخیال طلباً اکثر اُن کی صحبت میں
دیکھے گئے تعجب ہوتا کہ یہ نوجوان جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے
بھی کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ میں نے مرحوم سے ایک دفعہ
اس کی وجہ پوچھی، بولے دُنیا میں ایک ہی علم تو ہے نہیں ہر علم کے تار و پود
ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں ایک ہی علم کی تکمیل مختلف علوم یعنی مختلف
معلموں سے ہوتی ہے پھر آپ تو جانتے ہیں کتابی اور اخباری علم (مسکرا کر)
"بزرگوں کے تصرّف" کا ہمیشہ محتاج رہے گا۔ جب علم ارزاں اور معلم نایاب
ہوں تو ظاہر ہے ہم آپ نظر انداز نہیں کیے جا سکتے!

اصغر صاحب مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا محل نہیں۔ لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آتا ہے اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو ان کا کلام۔

کلام سامنے آجانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آنا نہیں ہے بلکہ جمال و کمال کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے جسے ان کا کلام بروئے کار لاتا ہے۔ ان کا کلام انہیں کی طرح محبت کرنے والا رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے۔ اصغر آپ کو فکر کی زحمت نہیں دیتے یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں وہ اپنے فکر کے رنگین و رعنا نقوش سے آپ کی مدارات کرتے ہیں۔ اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

اس سلسلہ میں محض افہام تفہیم کی خاطر میں ضمناً اقبال کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہولیں گے اقبال آپ کو سر مو ادھر ادھر نہ ہلنے دیں گے۔ اصغر سے آپ

خود علیحدہ نہ ہوں گے۔ اقبال کے ہاں تصوراتِ جمیل اور دعوتِ دید۔
اقبال حکومت کرتے ہیں اصغر رفاقت کرتے ہیں معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں۔ اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے در و بست کے اہتمام (ترصیع) میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے ہیں اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اصغر کی زندگی ہی سلیقہ شرافت اور صداقت میں گزری ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہوگا۔ اصغر سرتا سر غزل گو ہیں لیکن ان کے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلمہ عریانی یا خام کاری نہ ملے گی آپ ان کا کلام بے تکلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقہ سے اپنے کلام میں برتا ہے۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجرباتِ جنسی نہ ملیں گے بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں ان کی رغبتیں اور ان کی ذمہ داریاں ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے، کیمیائی یا نفسیاتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل۔ پھر وہ اس تحلیل کو الفاظ و معنی کیف و الم رنگ و آہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خط و خال نظر آتا ہے۔ عارفانہ بصیرت اور شاعرانہ صناعت کاری کا معجزہ بھی یہی ہے۔

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ تھوڑے بہت لکھے پڑھے بھلے مانسوں

میں بیٹھے اور ذوق بصیرت رکھتے ہوں۔ شاعری نہیں دنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے، اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں، قصور اُس مقصد اور معیار کا ہے جس کے اصغر واضع نہ مقلد نہ مدّاح!

اصغر صاحب اپنے کلام کی جنّت میں ہمیشہ زندہ و قائم رہیں گے!

ایوب

تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی!

محمد ایوب عباسی مرحوم کے بارے میں کیا کہوں اور کہاں سے شروع کروں! وہ اتنے اچھے تھے اتنے ارزاں تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ اُن کے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہیں وہ۔ یہاں سے نہیں وہاں سے۔ ابھی نہیں آگے چل کر۔ یوں نہیں ووں۔

وہ موجود تھے تو اُن کی مثال نعائمِ فطرت کی تھی۔ مثلاً ہوا پانی۔ روشنی جو اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی۔

لیکن اُن میں سے کسی میں کہیں سے کوئی فرق آ جائے تو پھر دیکھئے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور یہی ناقابلِ التفات چیزیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔

ایوب ایسے ہی تھے۔ وہ دوستوں کی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ گھل مل گئے تھے کہ ہم سب کو اُن کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا لیکن جب وہ ہم سے رخصت ہو گئے تو ہم میں سے ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ جو چیز ناقابلِ التفاتِ حدتک ارزاں وعام تھی وہی ناقابلِ بیان حدتک اچھی ضروری اور نایاب تھی۔

ہم سب کی زندگیوں میں مرحوم کے گھل مل جانے کا راز یہ تھا کہ اُن میں بظاہر کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے دولت مند نہ تھے۔ کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے۔ نہ انھیں توڑ جوڑ آتا تھا۔ نہ خوش پوشاک، نہ خوش گفتار۔ نہ خوش باش۔ نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی زیادہ معمولی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی نہیں اور نہ اب ڈھونڈھے سے بھی کوئی ایسا ملے۔

سیاہ فام، چیچک رُو، پست قد، نحیف الجثہ۔ پہلے پہل کوئی دیکھے تو مُنہ پھیر لے۔ برتے تو غلام بن جائے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ایوب کی خوبیوں نے اُن کی بدہیئتی کو اس درجہ دل آویز بنا دیا تھا فطرت اپنی چُوک کی بسا اوقات کسی بے دریغ بخشش سے تلافی کرتی ہے۔ میری ہی نہیں میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی اُن سے بڑی پُرانی ملاقات

چلی آتی تھی اور میں نہیں بتا سکتا کہ ہم سب کی زندگی میں ایوب کس قدر دخیل تھے اور اُن کی موت نے ہم سب کو کیسا بے قرار و مایوس اور کس درجہ بے دست و پا کر دیا۔ وہ میرے ہی دیار کے تھے۔ اور ایک بڑے مستند شریف ذی علم اور صاحب خیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ میں علی گڑھ میں تھرڈ ایر میں تھا جب ایوب فسٹ ایر میں داخل ہوئے بی۔ اے ایل۔ ایل بی ہو کر پروویسٹ آفس میں ملازمت کر لی۔ اور علی گڑھ ہی میں وہ بس گئے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیزوں و خوردوں کے ہم سبق تھے۔ علی گڑھ آئے تو ہم سب ایک ہو گئے۔ اور سترہ اٹھارہ سال تک ہر رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ یہ تو تھے میرے ذاتی تعلقات۔ اسی قسم اور اسی درجہ کے تعلقات مرحوم کے اوروں سے بھی تھے۔ اور سب جانتے ہیں کہ اُن کی جدائی کا جو الم مجھے ہے اُس سے کم دوسروں کو نہیں ہے! خدا ہی بہتر جانتا ہے، اس پیکرِ حقیر میں دلسوزی و خودسپاری کا کیسا بے کراں و بیش قیمت خزانہ ودیعت تھا۔

مجھ پر، میرے بچوں پر، میرے دوستوں پر اور میرے خاندانوں پر جان چھڑکتے تھے۔ خوشی کی بات ہو تو ایوب صاحب سب سے پہلے موجود اور سب سے زیادہ خوش۔ رنج و تردد کا موقع ہو تو سب سے پہلے حاضر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے یا ہر شخص کی خوشامد کر رہے ہیں۔ خوشی میں ہر طرح کے جملے فقرے سر کر رہے ہیں اور اپنی مسرت کا

طرح طرح سے اظہار کر رہے ہیں۔ رنج و مایوسی کا موقع ہو تو ایک حرف
زبان پر نہیں نہ تسکین کا نہ تعزیت کا چپ چاپ بیٹھے سراپا کا جائزہ
لے رہے ہیں۔ یا محبت و ہمدردی سے بے اختیار ہو ہو کر منہ تک رہے
ہیں۔ ذرا بھی احتمال ہوا کہ کسی کا آنا یا کسی معاملہ میں میرا دخل میرے لیے
تکلیف دہ ہوگا۔ تو اسے پہلے ہی سے بھانپ کر کسی نہ کسی طرح اس کا
سدِ باب کر دینا اور اس طرح کرنا کہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہو۔

میرا اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانا نہ ہو
اور ایوب سب کام کر دے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں جن کی تمام تر
ذمہ داری ہمیں پر ہوتی تھی لیکن اس سے بذاتِ خود عہدہ برآ ہونے
کے بجائے یا اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو ہم سب ایوب صاحب
ہی پر بگڑتے تھے اور بہانے نکال نکال کر انھیں سخت سست کہتے تھے
ایوب صاحب معمولی لنگی شیروانی پہنے۔ ٹوٹا چھوٹا جوتا۔ میلا سا مفلر
گلے میں لپیٹے جلدی جلدی چلے آ رہے ہیں۔ ہائے ان کا وہ چھوٹا سا قد۔
مشکل سے پانچ فٹ کا۔ مشغول و منہمک، مفلر جلد جلد کھولتے لپیٹتے۔
راستہ میں ہر ایک سے کچھ کہتے کچھ سنتے، گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں۔
ابھی فاصلہ ہی پر ہیں کہ جس شخص کے پاس آ رہے ہیں اس نے صلواتیں
سنانی شروع کر دیں۔ آ پہنچے تو سخت سست کی بوچھاڑ، ایوب صاحب
ہیں کہ نادم ہیں۔ ہنستے جا رہے ہیں۔ معذرت کر رہے ہیں دو چار صلواتیں
خود بھی سنا دیں۔ غرض دو چار منٹ کے بعد اطمینان ہوا تو ٹھکانے کی

باتیں ہونے لگیں - وعدہ کیا کہ کام کر دیں گے - نہ کریں تو جو چاہے کر لیے
چلنے لگے تو پھر کام کی تاکید کی گئی - پانچ سات صلواتیں سُنا دی گئیں
اور اتنی ہی سُن لی گئیں -

ایوب صاحب کا گھر بارہ چھینے تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بنا رہتا
تھا - ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں - بالخصوص اعزّا اور دوستوں کے
لڑکے مجھے یقین ہے اور میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایوب صاحب
کے گھر میں قیام کر کے، اُن کے خرچ سے اُن کی توجّہ و محنت سے اور
ان کے بل پر اعزّہ اور احباب کے جتنے لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل
کی ہو گی اتنا اب تک کسی اور شخص سے نہ اب تک ہوا اور نہ شاید
آئندہ ہو -

ان کے گھر میں طالب علموں کا وہ ہجوم کہ اندر جا کر دم گھٹنے لگتا
تھا - ہر شخص کو کھلانا پلانا، سامان دینا، ان کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنا
اور ان کی فکر کرنا اس کے بعد آفس کا کام، دوستوں کا کام الغرض اس
شخص کی مشغولیتیں دیکھ کر ہم سب تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص زندہ
کیسے ہے اور اس کے حواس کیونکر بجا ہیں -

اس کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں - کہ ایوب صاحب نے شاید
ہی کبھی اپنے گھر کھانا کھایا ہو - یا دو روز مسلسل اپنے گھر سوئے ہوں
جہاں مل گیا وہیں کھا لیا - اور ہو سکا تو وہیں رات بھر کے لیے پڑ رہے -
چارپائی بستر میسّر آئے یا نہ آئے - آرام کرسی پر سو رہے - میز پر لیٹ

گئے ورنہ کچھ لپیٹ کر فرش پر ہی ایک طرف سُکڑ سُکڑا کر رات بسر کر دی۔ مشکل سے ایک آدھ چپاتی اور تھوڑا سا سالن کھاتے تھے اتنا کم کھانے والا بھی شاید ہی کہیں ملے۔ کبھی کبھی ایک آدھ پیالی چائے پر ہی اکتفا کر لیتے تھے۔

سگریٹ اور حقّہ کے زیادہ شائق تھے۔ بیڑی، سگریٹ، سگار حقّہ جو مل جائے ان کے لیے کفایت کرتا تھا۔ دوستوں میں سے کوئی بیمار پڑا، اور یہ آموجود ہوئے، رات دن کا مسلسل قیام، پاؤں دبا رہے، سر میں تیل ڈال رہے ہیں، دوا لا رہے ہیں، کھانا تیار کر رہے ہیں اور بقول ہم یورپ والوں کے اس کا گو مُوت کر رہے ہیں۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر قسم کی زیادتیاں بھی سہہ رہے ہیں بیمار اچھا ہوا تو شکریہ میں بھی سخت سُست ہی کلمات کہے۔ ایّوب صاحب ہیں کہ خوش ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ایّوب صاحب کو جو لوگ صلواتیں سُناتے تھے وہ سب ایّوب صاحب کے گرویدۂ احسان ہو کر شعرا اور بے فکروں نے لطف و تشکر کے جتنے الفاظ وضع کیے ہیں وہ سب اُن گالیوں کے سامنے ہیچ تھے۔ جو ہم سب ایّوب کو دیتے تھے اور ان سے سُنتے تھے!

ایک دفعہ بیوی بچّے مکان گئے، میں اور دو بچیاں رہ گئیں۔ باورچی یک بیک چلا گیا۔ برسات کا موسم تھا میں دن بھر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرا تھا کوئی پانچ چھ بجے شام گھر واپس ہوا۔ دیکھا تو ہر چیز قرینہ سے

مکان میں لگی ہوئی ہے۔ بچیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں۔ ذرا ہی دیر میں ایوب صاحب آنکھ ملتے راکھ میں لت پت باورچی خانہ سے ڈانٹ کر بولے: جی گلچھرے اُڑائیے۔ لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں۔ چولھا ٹوٹا ہوا ہے، میں نے کہا کیا ہوا (کچھ سخت وسست الفاظ کے بعد) آخر ڈائننگ ہال کو کیا ہوا تھا۔ وہیں سے انتظام کر لیا ہوتا۔ بولے۔ جی شام کے پانچ چھ بجے آپ کے لیے ڈائننگ ہال سے باقرخانیاں نہ آجائیں، بچیاں کیا کرتیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آفس سے براہِ راست شہر گئے وہاں سے بچیوں کے لیے آم اور پکانے کے لیے کچھ ساگ ترکاری لائے۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانہ میں پل پڑے۔ ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے اُلجھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا بھئی ایوب خدا کے لیے کچھ تو ٹھکانے کی چیز کھا پی لیا کرو۔ ورنہ آنکھیں بھیک مانگنے لگیں گی۔ بولے جناب نے بھی تو منتخب ہی کھا کھا کر عینک کے نمبر بڑھائے ہیں۔

کھانا پینا ہو چکا تو آم نکلے۔ میرے سامنے تو قلمی اور لنگڑے رکھے اور خود چوسنے والے آم لیے میں نے کہا یہ کیا یہ آم کیوں نہیں لیتے کہنے لگے یہ آپ ہی کو مبارک ہو مجھے تو چوسنے والے ہی پسند ہیں۔ میں نے کہا چوسنے والے اپنے گھر کھائیے گا۔ میرے ہاں اس قسم کی کوئی حرکت کروگے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔ کھانا پینا ختم ہوا تو اپنی کھری چارپائی بچیوں کی چارپائی کے درمیان بچھا کر لیٹ گئے

اور اُن سے اُنہی کی دلچسپی کی ادھر اُدھر کی باتیں کرنی شروع کردیں جب وہ سوگئیں تو سر سے پاؤں تک کمبل تان کر خاموش ہو گئے۔ میں نے دیکھا تو کہا۔ ایوب تم اس گھر سے نکلو۔ اس بڑی گرمی میں کمبل اوڑھ کر برآمدہ میں سو گئے تو ظاہر ہے تمام رات میں صحن کے اس چبوترہ پر رقص کروں گا۔ کیا فائدہ صبح میں پاگل خانہ پہنچایا جاؤں اور تم قبرستان۔ نہ مانے اور اسی طرح سوئے اُن کا یہی معمول تھا۔

صبح جیتے جاگتے اُٹھ بیٹھے اور دن کے دھندے میں لگ گئے۔

علی گڑھ میں داخلہ کا زمانہ بڑے ہنگامے کا ہوتا ہے۔ سارے بزرگان قوم جو سال بھر ہم سب کو گالی اور اخبارات کو پیام دیتے رہتے ہیں سیشن کے شروع ہوتے ہی ہم کو قرونِ اولیٰ کا مسلمان قرار دے دیتے ہیں پہلے خطوط آنے شروع ہوں گے اُس کے بعد تار اُس کے بعد تک نکلیں گے۔

"خلاصہ فریاد" ایک ہی ہوتی ہے۔ یعنی لڑکا آپ کا ہے، یونیورسٹی قوم کی ہے اور حکومت ہندوؤں کی۔ لڑکے کو داخل کرائیے جتنی مراعات ہو سکیں دلوائیے۔ بقیہ خود پوری کیجیے۔ چال چلن اور خواندگی کی نگرانی کیجیے۔ پاس کرائیے۔ نوکری دلوائیے اور ہم دونوں کو اُس وقت تک مہمان رکھیے۔ جب تک کہ لڑکا یہاں کے ماحول سے آشنا اور خود اُن سے متنفّر نہ ہو جائے! حج اور تبرکات کے بارہ میں تو یہ طریقہ ہے کہ ملکوں کے مختلف مطوّف اور پنڈوں نے ٹھیکے لیے ہیں آپ چاہیں یا نہ چاہیں یہ آپ کی جان و مال کے ذمہ دار یا خدائی فوجدار ہیں۔ جان

کے کم، مال کے زیادہ ۔ علی گڑھ کا دستور اس سے بالکل مختلف ہے جس کا جی چاہے جس جس مطوّف یا پنڈے کے ہاں ٹھہر جائے ۔ اور اس کی جان مال و ناموس کا لاگو بن جائے ۔ داخلہ کا زمانہ عین برسات کا ہوتا ہے ظاہر ہے برسات میں شکم پروری اور قوم کی مرثیہ خوانی بیک وقت زور پہ ہو اور کام کوئی نہ ہو تو معدہ کب تک ساتھ دے گا ۔ والدین[1] میں سے کوئی پیچش میں مبتلا ہے ۔ کوئی اسہال میں، کسی کو یونانی علاج موافق نہیں آتا ۔ کسی کو ڈاکٹری دوا سے اصولاً اختلاف ہے ۔ کھانا ناشتہ

---

[1] یہ لفظ لغوی معنوں میں نہیں استعمال ہوا ہے یہ علی گڑھ میں ترک موالات کے زمانہ کی یادگار ہے ۔ جب ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی بزرگ اپنے لڑکے کو سمجھانے سنبھالنے علی گڑھ آیا تھا ۔ اس زمانہ میں طرح طرح کے بزرگوں کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ لوگ گھبرا گئے تھے ۔ چنانچہ اب جس لڑکے کے ساتھ غیر معمولی لیکن چالیس سال سے زائد عمر کے بزرگ کو کوئی دیکھ لیتا ہے فوراً کہہ پڑتا ہے "فھو الوالدین" یہاں تک کہ اگر کسی لڑکے کے ساتھ گھر کا کوئی پرانا نوکر بھی آئے تو لوگ کہیں گے فلاں صاحب کے ساتھ "ایک والدین" بھی ہے ۔ ایک والدین کا فقرہ علی گڑھ میں قطعاً موزوں سمجھا جاتا ہے ۔ مثلاً میں فلاں جگہ جا رہا تھا ۔ راستہ میں ایک والدین ملے ۔ چنانچہ علی گڑھ کی لغت میں والدین کے معنی خواہ مخواہ ماں باپ کے نہیں ہیں" بلکہ کوئی بزرگ نما صورت کا اجنبی جو کسی طالب علم سے وابستہ نظر آجائے والدین ہے ۔

سب کو موافق۔ حکیم صاحب کے ہاں لے جائیے یا اُنھیں بلائیے تو بتائیں گے موجودہ تکلیف اور علاج کرائیں گے۔ دیرینہ ناگفتہ بہ شکایات کا۔

اس زمانہ میں اور ایسے مواقع پر ایوّب مرحوم کام آتے تھے۔ کسی کے لیے چارپائی کی ضرورت ہے۔ تو وہ لا رہے ہیں۔ کسی کے پاس سرٹیفکیٹ نہیں ہے اس کی سبیل نکال رہے ہیں۔ کسی کو مخصوص بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہیں مل رہی ہے تو اس کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں کسی کے پاس روپے نہیں ہیں تو ادائیگی بالاقساط کی کوشش کر رہے ہیں کسی کے پاس کتاب یا فرنیچر نہیں ہے تو اُس کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کوئی اسٹریچی ہال کے محشرستان میں کھو یا گیا ہے تو اُسے راستہ پر لگا رہے ہیں۔ والدین یا سرپرستوں کے لیے حقّہ یا پرانے اُردو ناولوں کی ضرورت ہے تو اُسے فراہم کر رہے ہیں۔

اور سب کچھ ہو گیا تو اشارہ کنایہ سے حیلہ حوالہ سے خوشامد کر کے رو پیٹ کر جھنجھلا کر آمادۂ قتل یا خودکشی ہو کر مہمان کو میزبان کا گھر چھوڑنے اور اپنے اپنے ٹھکانے پہنچنے کا مرحلہ طے کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی جگہ نہیں ہو رہا ہے میرے گھر آپ کے گھر، دوستوں کے گھر، اور خدا جانے اور کہاں کہاں یہی ڈرامہ ہو رہا ہے۔ ایوّب صاحب ہیں کہ اپنے فرائض اور اپنی مصیبتوں کو نظر انداز کر کے دوستوں اور دوسروں کی مصیبت میں شریک ہیں۔ میزبان مہمانوں سے تو کچھ بولتا نہیں۔ لیکن آخر غم و غصّہ نکالنے کا کوئی موقع تو ہو۔ اُس کے لیے ایوّب صاحب تھے۔ اُنھیں بلایا

گیا، یہ پہنچے تو کچھ متردد ہوئے کچھ نادم اور کبھی تالی بجا کر قہقہہ لگانے لگے پھر بولے "شروع معلوم ہوتا ہے کوئی اور آیا یا کسی اور کو دست آئے۔ رشید صاحب! واللہ خوب ہوا بڑا مزہ آرہا ہے! اور لکھیے مزاحیہ مضمون[1]"

ایوب مرحوم کو برج کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اُن کی زندگی میں اور کچھ انہی کی وجہ سے ہم لوگ بھی اس کے بڑے شائق ہو گئے تھے بازی نہیں لگائی جاتی تھی اس لیے کہ ہم میں ایک سے ایک اناڑی کھیلنے والا تھا، جتنا کھیلتے اتنا ہی کھیل میں تنزل کرتے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو خواہ وہ جیتے یا ہارے سخت سست اتنا کہہ لیتے تھے کہ کسی اور بدل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں ہریجن کا لفظ اخبارات میں آیا تھا۔ بے تکلف صحبتوں میں ایوب مرحوم کا بھی نام رکھ دیا گیا تھا مرحوم بھی کچھ کم نہ تھے۔ ہم سب کو بھی ایسے ایسے ناموں سے پکارتے

---

[1] ایک دن میں اور ایوب مرحوم بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی بزرگ ملنے آئے شکل سے کچھ قومی کچھ علمی اور تھوڑے بہت مزاہ یافتہ معلوم ہوتے تھے! اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے حرفِ مطلب زبان پر لائے، یہ بھی ہو لیا تو اور باتیں شروع کر دیں۔ بالآخر رخصت ہونے لگے تو بولے۔ رشید صاحب آپ جیسا مزاحیہ مضمون لکھنے والا کوئی اور نہیں! ایوب صاحب اُٹھ کر کمرہ میں بھاگے بڑی دیر میں برآمد ہوئے ہنستے ہنستے لوٹے جا رہے تھے اور بار بار کہتے تھے اور لکھیے مزاحیہ مضمون!!

تھے کہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ ان کے بغیر تاش کی صحبتیں بالکل بے کیف ہوتی تھیں۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ ایوب مرحوم کھیل میں موجود نہ ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب نے تاش پھینک دیئے کہ بغیر ہر یجن کے کوئی لطف نہیں۔

رات زیادہ گزر چکی ہے۔ ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کی موٹر پر ہم سب اُن کی تلاش میں نکلے، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کسی دوست کے ہاں ملے۔ اپنے گھر چونکہ رہتے ہی نہ تھے۔ اس لیے وہاں ہم سب کبھی نہ گئے۔ دوست کے ہاں بھی رونق محفل وہی تھے اس لیے وہ لوگ بھی مارنے مرنے پر تیار ہو گئے کہ ایوب کو جانے نہ دیں گے۔ بڑی بڑی خوشامدوں سے بامشکل انھیں لائے۔ اور محفل پھر سے جمی۔

تاش کے شائق اتنے تھے، لیکن براہِ راست کبھی نہیں کہتے تھے کہ چلیے "تاش کھیلا جائے۔ آئے اور بیٹھ گئے، اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں، میں خوب سمجھتا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ اس لیے عمداً غیر متعلق باتیں چھیڑتا رہا، یہ برابر وار خالی دیتے رہے۔ آخر کار میں نے کہا: "ایوب تم کو تو "تاش کا ہیضہ ہے، نہایت سنجیدگی سے بولے: "جی ہاں، آپ لوگوں کو تو شاید چھینک بھی نہیں آتی۔"

میں تیار ہوا، دونوں اصغر کے ہاں پہنچے۔ ہم خوب سمجھتے تھے کہ وہاں کیا پیش آئے گا۔ ایوب مرحوم کو دیکھتے ہی للکارا: "ہریجن دروازہ کے اندر قدم نہ رکھنا، مرحوم بولے: "بس بس ڈاکٹر صاحب بہت زور نہ باندھیے۔ دروازہ کے اندر سے خود تو کبھی قدم باہر نکالنے کی ہمت نہیں

ہوتی اور جھبکی یہ! دیکھئے دانتے میں ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں بھی آگئے تھے،
معززینِ شہر تشریف لائے ہیں"۔ اصغر صاحب بولے: "لعنت ہے معززینِ
شہر پر اور آپ پر بھی"۔ اسی سانس میں نوکر کو آواز دی، "میز بچھاؤ،
پان وان لے چلو" ایوب مرحوم سے مخاطب ہو کر بولے: "کیوں جی
باورچی تلاش کیا"؟ مرحوم بولے "بھیجا تو تھا، آپ کو ملا نہیں"؟ بولے لعنت
ہے، باورچی بھیجا تھا یا بھنگی! اپنی ہی شکل کا ڈھونڈتے ہو"۔ مرحوم نے
نہایت سنجیدہ ہو کر جواب دیا: "ڈاکٹر صاحب! کیا کروں، آپ کی شکل
والا تو یونیورسٹی والے نہیں چھوڑتے، کہا کیا جائے"۔

ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادر پہلو یہ تھا کہ
بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا ان سے عزت آمیز محبت کرتا
تھا۔ ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان سے محبت کرنے میں اسے لطف
آتا تھا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی تھی، ایک طرح
کی پُر افتخار اور اطمینان بخش تسکین۔ جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی
کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہے۔ محبت کی ایک قسم وہ بھی
ہوتی ہے جو اپنے سے حقیر یا پست حال سے کی جاتی ہے۔ جیسے لوگ
اپنے کتے سے کرتے ہیں! یعنی اسے سمجھتے کتا ہی ہیں، لیکن چومتے چمکارتے
رہتے ہیں۔ اس قسم کی محبت بالعموم بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں۔
لیکن ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ محبت یا اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے اعتبار
سے تو لوگ انھیں السمان سمجھیں، لیکن خود ان کے جذبۂ فرعونیت کی تسکین ہو

یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبّت کرتے ہیں اور اسی طور پر اس کی زندگی میں ابد و فخر کی ہلکی سی لہر دوڑا کر ہم چشموں میں بیٹھنے اور سر بلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں - اس طرح کی محبت یا عزت ایّوب صاحب سے کرنے کی کسی کی ہمّت نہ ہوتی تھی - ایّوب صاحب وہ تھے جن کے لیے ہر شخص اپنی عزّت یا شہرت کو داؤ پر لگا دینے کے لیے بے تامّل تیار ہو سکتا تھا -

ایّوب سے محبّت نہ کیجئے یا ان کی عزّت نہ کیجئے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفانہ جذبات یا احساس ذمّہ داری کی کمی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدِّ نظر رکھیئے کہ ایّوب صاحب کے دل میں یہ بات کبھی گزری ہی نہیں کہ ان کی خدمات کا صلہ مل رہا ہے یا نہیں معاوضہ کا احساس شاید ان میں پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا - بڑے چھوٹے کی خدمت یکساں لطف و تن دہی سے کرتے تھے - پرووسٹ کے دفتر میں سب سے اہم عہدہ پہ ہونے کے سبب ان کا سابقہ طلبا، اساتذہ، بیرا، باورچی، نائی، چپراسی، بھنگی بہشتی سب ہی سے براہِ راست پڑتا تھا - طلبا کو خوش اور مطمئن رکھنا معمولی بات نہیں ہے - ان کا ایّوب صاحب سے طرح طرح سے سابقہ پڑتا تھا - وہ ہر طالب علم کے خاندانی حالات و معاملات سے واقف رہتے تھے - اور اسی اعتبار سے ان سے سلوک کرتے تھے - اس لیے ہر طالب علم ان کو اپنے گھر کے بزرگ اور خیر اندیش کی حیثیت سے دیکھتا تھا - یونیورسٹی میں اسٹرائک ہے، لڑکے ہیں کہ بے قابو ہوئے

جاتے ہیں۔ لیکن ایوب صاحب کا جادو برابر کام کر رہا ہے۔ ایسے زمانے میں ان کا طرزِ عمل لڑکوں سے وہی ہوتا جو میدانِ جنگ میں صلیب احمر کا ہوتا ہے۔

ادنیٰ درجہ کے ملازمین سے ان کا سلوک مساوات اور ہمدردی کا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ ایوب کو اپنا افسر نہیں بلکہ رفیق سمجھتے تھے ایک دن میں نے دیکھا کہ بہشتیوں کی کانفرنس کی صدارت کر رہے ہیں جیسا کہ ایسی کانفرنس میں ہوتا ہے، ہر بہشتی آپے سے باہر تھا۔ ایوب صاحب جلدی جلدی سگریٹ پیتے اور بار بار پاجامہ اونچا کرتے جاتے تھے۔ ہر ایک سے مخاطب ہوتے تھے۔ کبھی خود جامے سے باہر ہو جاتے اور کبھی نہایت متانت سے سمجھانے لگتے۔ میں اُدھر سے نکلا تو کچھ سٹ پٹائے اور شرمائے۔ میں نے کہا: "واللہ، ایوب آج تو بہچاننا دشوار ہو گیا۔ جا کر مولانا[1] سے کہوں گا کہ نوح کا پسر بدوں میں بیٹھے بیٹھے بہشتیوں میں بیٹھنے لگا ہے۔" ہاتھ پر ہاتھ مار کر بڑے زور سے ہنسے۔ کہنے لگے: ہاتھ جوڑتا ہوں، ذرا بیٹھ جائیے۔ واللہ بڑا مزہ آئے گا"، میں نے کہا: "جی نہیں، آپ کو کیا، آج یہ ہے کل بھنگیوں کی کانفرنس کی صدارت کرنے لگیں گے"۔ فرمایا: "ہرج کیا، پانی اور فنائل کا انتظام تو کہیں گیا نہیں"۔

---

[1] مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب قبلہ ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایوب صاحب کے عزیز قریب اور بزرگ۔

غرض میں چلا آیا، ایوب صاحب بھی صدارت سے فارغ ہو کر تاش کھیلنے کے وقت پہنچ گئے۔

ایوب صاحب یونیورسٹی کے معاملات یا الجھنوں سے ہمیشہ علیحدہ رہتے اور حتی المقدور اپنے دوستوں کو بھی علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے مسائل پر انھوں نے مجھ سے گفتگو نہ کی۔ کبھی فرصت ہوئی اور یقین ہوا کہ میں گھبراؤں گا نہیں تو وہ اپنے خاندانی قضیوں کا تذکرہ چھیڑتے اور جو کچھ دل میں ہوتا بیان کر دیتے۔ میں ان کی الجھنوں کو ہمدردی اور توجہ سے سنتا تو ایسا محسوس کرتے جیسے ان کا جی ہلکا اور اُن کے دکھ درد کا مداوا ہو گیا وہ اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے سب کے سب ایوب صاحب کی شرافت اور کشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے رہتے تھے۔ اس کا انھیں غم تھا اور غم غلط ہی کرنے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے ایک دن بہت اداس تھے، آئے تو میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی بہل جائے۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یک بیک آبدیدہ ہو گئے! میں نے پوچھا تو بڑے تامل کے بعد واقعہ سنایا وہی عزیزوں کی دنائت اور شقاوت کا۔ میں نے کہا: "ایوب صاحب آپ بددل نہ ہوں، آپ کا کوئی قصور نہیں، قصور ہے تو صرف اتنا کہ آپ خوش حال اور نیک نام کیوں ہیں۔ ہمارے آپ کے اعزا کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اٹھا لی گئی ہے، اغیار کو توبہ مسرور اور بافراغت دیکھ کر خوش ہوں گے اور فخر کریں گے، لیکن اپنوں کو کھاتا پیتا یا ہنستا بولتا دیکھ کر غم و غصہ

کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے۔ یہ اپنے نکمے پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا حربہ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے کماتے کماتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے اُن تمام نعمتوں پر قبضۂ مخالفانہ کر رکھا ہے۔ جو بصورتِ دیگر ان کے قبضہ میں آتیں۔ وہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے ایمان ہیں اور جو فراغت، ناموری اور نیک نامی سے رہ رہا ہے، اُس نے کتنی محنت کی ہے اور اذیت اُٹھائی ہے۔

اور یہ کچھ ہمارے بیشتر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ اس انفرادی کمزوری اور کمینگی نے پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے جماعتی ہی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی بھی۔ سرمایہ و مزدور کی جنگ اپنی جگہ پر حق بجانب ہے اور جہاں تک اس کے اخلاقی و اقتصادی پہلوؤں کا تعلق ہے اس کے معقول ہونے میں شبہ بھی نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس اسکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کے درپے بیشتر وہی لوگ ہیں جو نکمے بر خود غلط اور کینہ پرور ہیں۔ دُنیا کے کسی آشوب کا مطالعہ کیجیے آپ کو بالآخر یہی نظر آئے گا کہ معقول نظام یا تحریک نامعقولوں کے ہاتھ میں تھی۔ آپ ہی سوچیے کیا مزدور اور کاریگر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اس دُنیا میں قابلِ عزت و لحاظ نہیں ہے۔ دُنیا کی نجات دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں ہے بلکہ محنت اور قابلیت کے صحیح احساس و تنظیم پر ہے میں آجکل بازیگروں کے اصولِ تقسیم کا بالکل قائل نہیں جس سے "دولت" اُن کے ہاتھ میں جائے اور "مساوی" میرے ہاتھ میں رہ جائے!

آخر بابی میں نے اُن سے کہا: "ایوب صاحب! اپنا کام کئے جائیے!
دولت و شہرت کا حساب عزیزوں کو نہیں اللہ تعالیٰ کو دیا جائیگا! البتہ آپ
اس کے لیے تیار رہیے کہ جتنا اللہ آپ کو کارگزار، فارغ البال، نیک
نام اور بھلا مانس بنائے گا، اتنا ہی شیطنت آپ کی دشمن بنی جائے گی۔

مرحوم اپنے جن بزرگوں یا دوستوں کو عزیز رکھتے تھے انھیں میرے
ہاں ضرور لاتے اور مجھ سے ملا کر بہت خوش ہوتے۔ پھر بڑا اصرار کرتے کہ میں
اُن سے ان کے گھر یا جائے قیام پر جا کر مل آؤں۔ یہی نہیں بلکہ جس کسی کو
تکلیف یا مصیبت میں دیکھتے یا اس کے ہاں خوشی کی کوئی بات ہوتی تو
مجھے خبر کرتے کہ میں وہاں ہو آؤں۔ میں ایسا کر دیتا تو ان پر مسرت و
شکر گزاری کا عجیب عالم طاری ہوتا۔ ظاہر ہے اس سے ان کا مقصد یہ تھا
کہ میری اس بھلمنساہٹ کی لوگ قدر کریں۔ لیکن یہ بات یہیں نہیں ختم
ہو جاتی واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا بات سے انھیں تعزیت یا مسرت پہنچتی
تھی اس میں وہ مجھے بھی شریک کر لینا چاہتے تھے دوسرے یہ کہ میں نے
ان کے انتخاب کو پسند کر لیا تو اس پر استناد کی مہر لگ گئی۔ تیسرے
یہ کہ انھوں نے جس کو مجھے ملایا اس کے ساتھ بہت بڑا سلوک یہ کیا کہ مجھ
ایسے (بزعم خود) معقول آدمی سے اسے متعارف کیا۔ بظاہر یہ باتیں دور از کار
اور خود میرے برخود غلط ہونے پر دال ہیں اور اپنے منہ سے ان کا تذکرہ کرنا
میرے لیے بڑی بھدی بات ہے لیکن میں مرحوم کی بعض تحت شعوری سے
واقف ہوں۔ ان کا مقصد وہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سُنیئے۔ ایک دن بڑے اصرار سے کہنے لگے کہ رشید صاحب پتلون پہنا کیجیے۔ میں نے کہا آخر کیوں۔ کہنے لگے ہرج ہی کیا ہے۔ میں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ آخر اس فرمائش کی تک کیا ہے۔ کہنے لگے کہ جی چاہنے میں تک کو کیا دخل۔ میرے ان کے ایک بے تکلف دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ ردو قدح سُنی تو معاملہ کی نوعیت دریافت کرنے لگے۔ میں نے بتایا تو اُچھل پڑے کہنے لگے رشید صاحب قیامت تک نہ پہنیے گا۔ اس نے ایک پتلون سلوائی ہے۔ اسے پہننا چاہتا ہے۔ آپ سے ڈرتا ہے اس کی باتوں میں نہ آئیے گا۔ دیکھوں تو کس طرح پہنتا ہے!

یونیورسٹی سے ایک قطعۂ زمین مکان بنانے کے لیے میں نے پٹّہ پر لی یہ ایوب صاحب کے مکان سے متصل تھی۔ برسوں میرے پاس افتادہ پڑی رہی۔ مرحوم کا مسلسل اصرار رہا کہ رشید صاحب مکان بنوا لیجیے۔ ہر شخص بنوا رہا ہے آخر آپ کیوں نہ بنوائیں، تھوڑا سا حصّہ چھوڑ دیجیے گا اس میں ایک جھونپڑا ڈال لوں گا، مویشی پالوں گا، مرغیاں رکھوں گا اور کھیتی کیاری کر دوں گا۔ میں نے کہا "میں مکان نہ بنواؤں گا۔ ساری زمین آپ کی ہے جو چاہے کیجیے۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ سے کچھ ہوتا ہے یا نہیں" کہنے لگے "جی نہیں آپ مکان بنوا لیجیے میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ یہاں آپ کا مکان ہو، آپ تمام روپیہ خرافات میں اُٹھاتے ہیں مکان ہو گا تو ایک چیز ہو جائے گی۔ آپ قریب ہو جائیں گے، وسیع عالیشان

مکان میں سمجھوں گا میرا ہی مکان ہے، جب چاہوں گا چلا جایا کروں گا۔ ایک ٹھکانہ ہو جائے گا۔"

مکان بنا لیکن ایوب کا ارمان پورا نہ ہوا۔ اب وہ اور ان کا ارمان دونوں یونیورسٹی کے گورستان میں آسودۂ راحت ہیں۔ یہاں پہنچکر مجھے بے اختیار اپنا چھوٹا چچا زاد بھائی جوانمرگ رفیق یاد آ گیا۔ جس نے بارہ تیرہ سال تک مرتے دم تک مجھ پر اور میرے بیوی بچوں پر اپنی روشن و رنگین زندگی کی وہ متاع نثار کر دی جس کی قیمت اس دنیا میں آج تک کوئی نہیں لگا سکا، آہ کیا نثار ہونا اور کس کس طرح نثار ہونا! جس نے تمام عمر یہ خیال دل میں نہ آنے دیا کہ اپنی استعداد سے اپنے آپ کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنا چاہیئے۔ بلکہ اسی کا قائل رہا اور اسی پر مرمٹا کہ اس کی ہر نعمت اور اس کی ہر متاع میرے اور میرے بیوی بچوں ہی کو راحت و فائدہ پہنچانے کے لیے تھی۔

بہادر اور باوفا رفیق بھی مکان کا ارمان اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ میں اپنا مکان دیکھ کر مسرور و مطمئن ضرور ہوتا ہوں لیکن جب رفیق اور ایوب یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہو کر ناممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے یعنی کاش دونوں زندہ ہو جاتے اور میں انھیں اسی مکان میں گلے لگاتا ان کا خوش ہونا اور دھوم مچانا دیکھتا اور مطمئن ہو جاتا کہ میں نے بھی کچھ کام کیا!

سردی کا زور اور دوستوں کا مجمع تھا۔ ہم سب ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں کے ہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ ایوب مرحوم نے کہا "سردی لگ رہی ہے

کسی نے توجہ نہ کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد لیکن کسی قدر بے قرار ہو کر کہا "بڑی سردی ہے، رشید صاحب میں چلا" ڈاکٹر عبابو نے کہا "نہ ٹھکانے سے کھاتے ہو نہ شریفوں کی طرح رہتے ہو سردی کیوں نہ لگے"۔ یہ کہہ کر اندر سے اپنا وزنی گرم اوورکوٹ لائے اور مرحوم کو اچھی طرح اُوڑھا دیا۔ چائے منگائی اور پلائی۔ اس کے بعد بھی مرحوم نے کہا "رشید صاحب میں چلا، میں ان کے لہجہ سے اور ان کے چہرہ کی طرف دیکھ کر چونکا۔ کھیل ختم کر دیا گیا اور ہم سب انھیں اُوڑھا ڈھکا کر ان کے مکان پر پہنچا آئے۔ صبح سے بخار نے زور پکڑا۔ لاکھ لاکھ جتن کئے گئے لیکن کمزوری بڑھتی ہی گئی۔ دوستوں کی تشویش بڑھی۔ مایوسی بڑھی اور مرض الموت بڑھا۔ دو تین ہفتہ کے اندر سب کچھ ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا ہے۔ سب نے یہی فیصلہ کیا کہ وقت آپہنچا۔

شام کے قریب نزع کے عالم میں تھے۔ مکان کے باہر یونیورسٹی کے طلبا اور عمائدین کا مجمع تھا لیکن ان سے قریب اور ان ہی میں ملا جلا ایک اور ہجوم تھا۔ بھنگی، بہشتی، چپراسی، نائی، دھوبی، بیرے، باورچی خانساماں، خوانچہ والے اور ان میں سے بہتوں کے بیوی بچے خاموش، مایوس سر جھکائے! اور یہ وہ ہجوم تھا جو کسی مرنے والے کے دروازہ پر جب کہ وہ اس جہان سے گزرنے والا ہو۔ میں نے گزشتہ پچیس سال میں نہیں دیکھا تھا۔

مرحوم کو سپردِ خاک کیا گیا۔ مولانا ابوبکر صاحب نے قبر کے سرہانے کھڑے

ہو کر فرمایا :-

"بھائیو! ایوب اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے اگر اُن سے تم کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا"

گریہ سب کے گلو گیر ہوا- کسی نے روکا اور کسی سے نہ رُکا!

ایک غم نصیب کے قلب کی گہرائیوں سے ایک اور درد ناک صدا بلند ہوئی -

"کیا یہاں کوئی ایسا بھی موجود ہے جس پر ایوب کی خدمات کا صلہ واجب الادا نہ ہو" اس آواز کو سُنا کسی نے نہیں محسوس سب نے کیا!

سر اقبال مرحوم

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

بڑی گرمی پڑ رہی تھی - دور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا تھوڑی دیر کے لیے، بہت تھوڑی دیر کے لیے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت - یہ بات صرف ایک آن کے لیے تھی، آسیائے گردشِ ایّام ایک آن کے لیے رُک سی گئی لیکن فوراً ہی رواں

ہو گئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا، نہ کھانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کو جی چاہا، جیسے نفس اپنے مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرہ بند کر کے لیٹ رہا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر دیئے۔ طفلی کا زمانہ یاد آیا، جب اقبال کے اشعار چھٹ پنے کی دوستی کی طرح مزیدار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور خود اقبال کا یہ تصور تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں اُنہی میں رہتے بستے ہیں، اقبال کی صورت وہی ہو گی جو میرے اپنے تصورات کے عمل سے پیدا ہوئی تھی۔ بہت اچھی سی، بہت چاہی جانے والی جیسی جادوگروں جیسی، کچھ عجیب سی!

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ اب بھی جبکہ ادراک و شعور ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے اچھے اشعار کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے۔ جو بچپن میں ہوتا تھا اچھا شعر ذہن میں آیا نہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے معلوم نہیں کیا چیز تصورات کو کہاں کہاں لیے پھرتی ہے۔ وہی افسانہ و افسوں، وہی روشنی و تاریکی، لذت و اذیت، خوف و اُمید جو بچپن میں پیدا ہوتے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں جہاں چاہتے ہیں لیے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں اب تجزیہ و تحریہ کی زد میں ناقابلِ فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ میں صرف پڑھنے اور اپنے طور پر

لطف لینے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ اب پڑھانے کو پُر فکر و پُر لطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا، اور نثر دلآویزی تاثرات پر ہی نہیں بلکہ فکر و تجربہ کی صحت و صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے اس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے وہ اپنے ہی جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے یا دوسروں کی تشفّی بھی۔

غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے، میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا، کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ سیاہ عُقدہ (بو) باندھتے، کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے، گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں، مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی، سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا، مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں لیے رہے، بھاری بھر کم لہجے میں بولے، "آپ ہیں جی صدیقی صاحب!" میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور ان کا حُلیہ دیکھ کر متحیّر اور مرحوم کے اندازِ تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر دل گرفتہ ہُوا۔

اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ قلم کا تلفظ سن کر میں گھبرا اٹھا۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا لیکن ذہن میں معلوم نہیں، کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوریوں سے مستثنےٰ ہوں گے۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابلِ بیان مروت و مرحمت تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا، جیسے ایک نیا تجربہ بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا گو اس کا منتظر نہ تھا۔ جیسے مجھے ایک نئی حس تفویض ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔

تھوڑی دیر کے لیے کمرہ میں آ بیٹھے۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے، آواز بھاری تھی لیکن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بڑھتی جاتی۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سنا ہے۔ یہی بات مجھے ذاکر صاحب میں ملتی ہے، علامہ مرحوم کی باتیں سنیئے بشرطیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہوگا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتی تھیں اور وہ صرف اپنے الفاظ اور فقروں پر نہیں

بھروسا کرتے تھے۔ بلکہ وہ باتیں کہیں دُور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھی
اُن کی گفتگو حشو زوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی بلکہ اتنی واضح اور
جامع ہوتی تھی کہ وضاحت و جامعیت بجائے خود صنائع و بدائع معلوم
ہونے لگتی تھی۔ گفتگو کرنے میں اُن کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتی
تھیں۔ البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تھی تو آنکھیں پوری
کھل جاتی تھیں اور چہرہ پر گرمی و روشنی جھلکنے لگتی تھی۔

اُسی دن شام کو دوسری ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اُس دن ایک
نوجوان شاعر آگئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سناتے رہے۔ اُن کی شاعری
اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا۔ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ نوجوان
کی گفتگو میں تعلّی زیادہ تھی، ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خاموشی کسی قدر بیزاری
میں تبدیل ہونے لگی تھی کچھ دیر تو بیٹھے رہے اُس کے بعد اُٹھ کھڑے ہوئے
صحبت ختم ہو گئی۔ صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے۔ اندر سے دیر میں برآمد
ہوئے چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا۔ تھوڑی دیر تک حقہ کا ٹھہر ٹھہر
کر کش لیتے رہے، اس کے بعد فرمایا، نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب
نہ ہوتے تو نعمت لعنت بن جاتی ہے اُس کے بعد کچھ اور لوگ آگئے۔ اب
طبیعت بحال ہو گئی۔ ہر ایک سے پرسشِ حال کرتے وہ بھی اس طور پر نہیں
کہ موسم اچھا ہے یا بُرا۔ رسمی باتیں تو وہ کرنا ہی نہیں جانتے تھے۔ ہر ملنے
والے سے اُس کے مشاغل اور اُس کا مقصود و دُکھ سُکھ سُنتے۔ لوگ مرحوم
کے حلقہ میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہمے ہوئے نہیں بیٹھے تھے۔ بلکہ

محبّت اور بے تکلّفی کی فضا ہوتی تھی ۔ ہر شخص مرحوم کی باتیں بڑی گہری توجہ سے سنتا اور خود بھی بے تکلّفی سے اپنی سُناتا ۔

دوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ آج کہیں جانا نہ تھا اس لیے بڑے اطمینان اور بے تکلّفی سے باتیں شروع کیں اُس زمانہ میں اقبال کے نظریۂ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا ۔ بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس لیے اس پر میں نےخاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا ۔ مرحوم نے بڑے ہی عالمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی اور خود اعتمادی کے ساتھ جو اُن کی سیرت کا بڑا ہی گرانقدر پہلو تھا ، اظہارِ خیال کرنا شروع کیا ۔ مجھے اس وقت جو چیز سب سے عزیز اور خوش آیند معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو مرحوم اس خوبی سے واضح کرتے تھے ، ایسا معلوم ہوتا جیسے متنازع فیہ مسئلہ میں کوئی کشیدگی تھی ہی نہیں ۔ عالمانہ و مخلصانہ نقطۂ نظر کی یہ کرامت ہے کہ ناگہانی پیچیدگیوں اور نامعلوم مسائل کا حل بڑی آسانی سے سامنے آجاتا ہے ۔ اسی صحبت میں عورتوں کا درجہ ، فوق البشر ، بعثتِ نبوی کا وقت اور مقام ، فقہ ٔ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے ۔ میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گذشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے لیکن ایک بات جس کا اعادہ میں بار بار کرتا رہا وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ اُن کے خیالات یا تصوّرات تمام کے تمام اُن کے کلام میں مقیّد ہو چکے ہیں بڑی غلطی ہے مرحوم کی فکر و نظر کا بہت کم حصّہ اُن کے کلام میں منتقل ہوا ہے ۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے ۔ اور یہی نہیں

بلکہ اکثر کچھ ایسا بھی محسوس ہوا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دورانِ گفتگو میں اُن پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہوگئیں۔

فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے مسودہ بھی ٹائپ ہوچکا تھا۔ اور کافی ضخیم تھا۔ فرمایا ان مسائل پر میں بعض مستند علماء سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے نزدیک کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سودمند ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کوچہ سے نابلد ہوں اس کے علاوہ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر علماء علمِ دین سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہیں اور ماہرینِ فن ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اس میں اُن پر ہمارے علمائے کرام مناسب رائے قائم کرنے سے معذور ہیں۔ جب تک متنازع فیہ مسئلہ کی ماہیت نہ معلوم ہو اُس وقت تک اُن پر صحیح حکم لگایا کیسے جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو نوعیت ہے اُس پر اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مرحوم نے یہ فرمایا کہ وہ اُن دونوں بزرگوں سے تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں یا کریں گے اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارہ میں مرحوم نے اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ تھا اور ہر بات کا جواب نہایت

واضح اور جامع ہوتا۔ وہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی بڑی صاف گوئی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح اُن میں یہ کمزوری نہ تھی کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بہ موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے۔ اُن کو اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا۔ اس کا سبب میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ وہ فلسفی مفکر اور مقنن ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے اُس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبّر کو دخل ہوتا چنانچہ اُن کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط ہوتا۔

اُن کی شاعری کا امتیازی پہلو بھی یہی تھا۔ جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبّر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی تدبّر حکیم یا فلسفی کی بڑائی اور کامیابی کی دلیل ہے ٹھیک اسی طور پر جذبات کا احتساب کرنا اور اُس کو مناسب موزوں اسالیب میں ڈھالنا شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور ایقان دوش بدوش کارفرما ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اُن کا کلام پڑھ کر ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں بلکہ حکیم اور شاعر (البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف لیکن بالآخر دونوں) ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال نے فطری ملکات کو بشری یا صنوں

اور ماورائی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت یا نوعیت بخشی
شاعر کا طبعاً شاعر یا متفکر ہونا میرے نزدیک کوئی بہت بڑی نعمت نہیں ہے
نعمت تو وہ توفیق ہے جو فطری استعداد کو بشری نعمت بناتی ہے اور غالباً
یہی توفیق وہ توفیق الٰہی ہے جو انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک
ہونے سے بچاتی رہتی ہے بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ انسانیت کو فوزِ عظیم
پر فائز کرتی ہے۔

علی گڑھ، ایک دن دوستوں کی ایک علمی صحبت میں حافظ کے مشہور
شعر ؂

صد بادِ صبا ایں جا بے سلسلہ می رقصد

ایں است حریف اے دل تا بادیہ پیمائی

پر گفتگو ہونے لگی۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر ایک نے خوب خوب موشگافیاں
کیں۔ بالآخر یہ طے ہُوا کہ ڈاکٹر اقبال سے رجوع کیا جائے چنانچہ مرحوم سے
استصواب رائے کیا گیا۔ مرحوم نے فوراً ہی جواب لکھ بھیجا۔ ہر رائے پر محاکمہ کیا
اور آخر میں لکھا کہ شاعر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو
کو ریاضیات کے اصول مدنظر رکھ کر پیش کرے اس لیے شعر کے مطالب جداگانہ
بھی ہو سکتے ہیں البتہ متضاد نہ ہوں آگے چل کر لکھا تھا کہ کبھی کبھی شاعر
اپنی واردات کا پورے طور پر خود استقصا نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں
اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف
رہبری کرے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا قوی امکان ہو اور جہاں

ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ لے۔ آخر میں لکھا تھا کہ شاعر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو منطق سے نہیں بلکہ ان رموز سے اپنا لے جو اس کے شعر میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں۔ شاعرانہ رموز نہ منطقیانہ رموز ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ وہ شاعرانہ ہی رموز ہوتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انہی دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے تھے، ایک دن صبح مکان تشریف لائے۔ اس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی مشکل سے باہر آیا۔ میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رک رک کر کہا ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی ہائے اُن کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمانا، نہیں جی صدیقی صاحب کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا، اچھے ہو جاؤ گے، پھر لاہور آنا، مایوس کیوں ہوتے ہو مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے۔

اس کے بعد دیر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں یہ بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اُٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں مبتلا

رہ کر عالمِ بقا کو سدھارے، کاش کسی وقت میں حاضرِ خدمت ہو کر ان کے لیے وہ کر سکتا تھا۔ جو انھوں نے میرے لیے کیا تھا، پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت بڑے شخص تھے ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی دے سکتا تھا وہ خاصانِ بارگاہ سے تھے ان کا خدا سے خاص تعلق تھا لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ گو معجزہ کا زمانہ نہیں رہا لیکن محبت و خلوص میں اب بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کون سی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے زائل نہیں کر سکتے۔

زندگی کے آخر عہد میں مرحوم کا توسل دربارِ بھوپال سے ہو گیا تھا اس تعلق کے پیدا کرنے میں سر راس مسعود مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل تھا اقبال کو جن مالی دقتوں کا سامنا تھا اب اس سے نجات ہو گئی تھی، دورِ آخر کی بلیشتر مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجاتِ اُخروی متیقن ہے۔ اقبال کو غمِ روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ اقبال کے بعض عقیدت مند سر راس مسعود مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیز و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلتوں پر مافوق رکھتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارہ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ

وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کرے گی لیکن شیکسپیئر کو چھوڑنا گوارا نہ کرے گی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبالؔ سے جدا ہونا گوارا نہیں کریں گے۔

مرحوم کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرا دیا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سنا تے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی موصوف کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلامِ پاک سن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارمغانِ حجاز میں دخترانِ ملت کو یوں مخاطب کیا ہے ؎

زشامِ ما بروں آور سحر را　　　به قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قرأتِ تو　　　دگر گوں کرد تقدیرِ عمر را

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلامِ پاک سننے کے لیے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی دیکھتے رہتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں، لیڈی مسعود کہاں ہیں۔

علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا، قرآن کیا سیکھیں گی، وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں، وہاں سے فرصت ملے تو آئیں، میں کیا کروں، مرحوم خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا صبر علی بخش صبر، یہ کلام بھی اتنا ہی ضروری ہے!

اہلِ نظر جانتے ہیں اقبال کی نظر کہاں تھی میرے نزدیک تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ اُن کی فکر و فرزانگی، شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے بڑے ہیں منفرد ملتے ہیں اور جدا ہو کر ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے۔

بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں ایک واقعہ مولانا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کر دیا جائے۔ مولانا تحریک خلافت کے سلسلہ میں یورپ جا رہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے مولانا سے سوال کیا، اور کیوں جناب راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کیوں نہیں دوسرے صاحب نے پوچھا معاف فرمائیے گا کیا میں دریافت کر سکتا ہوں۔ کس کس قسم کی اور کون سی کتابیں ہیں۔ مرحوم نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں اور وہی میں نے رکھ لی ہیں۔ حاضرین ان کتابوں کا نام سننے کے لیے سراپا اشتیاق بن گئے۔ مرحوم نے اپنے خاص انداز میں بتایا ایک تو کلامِ پاک ہے اور دوسری دیوانِ داغ!

اسے محض ایک لطیفہ ہی کیوں نہ سمجھا جائے لیکن یہ بیان واقعہ ہونے
بھی میرے نزدیک اس سے مولانا کی پُر تحمّل شخصیت کی دلربائی کچھ بڑھ ہی
جاتی ہے یہاں بھی کسی طویل نفسیاتی مذاکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل
مقصد دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرواز و پرداخت کی طرف صرف
اشارہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لیڈی مسعود کے پہلے بچّہ کی شیر خوارگی میں وفات
پا جانے پر رنجور ماں کو تسکین و تشفّی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر
لکھا تھا ؎

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود
آہ ! ازاں غنچہ کہ بادِ سحر اور انہ کشود

اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور
لیڈی مسعود اندور میں۔ نادرہ کی ولادت سے اقبال بے انتہا مسرور تھے
اور اس کو دیکھنے کے بے حد مشتاق۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود
اطلاع دیئے بغیر بھوپال آگئیں۔ اتفاق سے سر راس مسعود اور سر اقبال
دونوں یکجا تھے۔ سر راس مسعود نے فرطِ اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچّی کو
آغوش میں لینا چاہا۔ اقبال نے آواز دی۔ نہیں پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے
چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔

مجھے اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اس پر بھی غور کرے گی
یا نہیں کہ وہ نہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں

تھی اس کی نفسیاتی پرداخت کا اہتمام اپنے زمانہ میں اسلام کے سب سے بڑے اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور آغوشِ مادر سے سب سے پہلے براہ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی !

ڈاکٹر صاحب نے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لیے ایک شریف جرمن خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں ۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ سہہ چکی تھیں ۔ میں نے ہی ڈاکٹر صاحب سے تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہوں گی ۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی ۔ میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکر مند تھے ان کو معاوضہ کی کمی بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا ۔ لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجہ کاوش کرتے تھے کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا کہ آپ کا نقطہ نظر میں پورے طور سے سمجھ چکا ہوں ۔ مزید گفتگو سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ آپ امتحاناً انھیں دو ایک ہفتہ کے لیے اپنے ہاں بلا لیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں ۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ اُن کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں ۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے سب آپا جان کہا کرتے تھے لاہور پہنچ گئیں ، ان کے

پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے ان میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت وقابلیت، دیانت وامانت، محبت ومروت کا ذکر ہوتا، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان وبھروسا ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں اور سارے گھربار کو خاص طور پر ان کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون کا بڑے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات میں تذکرہ کیا۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد میں لاہور گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے جاوید اور بانو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر سیانا تھا ایک حد تک خاموش اور کم آمیز۔ کھل کر ملنے یا بات کرنے میں بھی تکلف کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مرحوم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور وہ اس کو کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جاوید ان کے کلام میں کہاں کہاں اور کس کس طرح جاری وساری تھا۔ لیکن میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بانو! مشکل سے ۶، ۷ سال کی عمر، کیسی تندرست چنچل، ذہین، خوب صورت، بھولی بھالی بچی! ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی تھی!!

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات بانو حسب معمول میری چارپائی پر لیٹی ہوئی باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی، پھر باتیں کرنے لگتی لیکن رہ رہ کر کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتی۔ میں نے پوچھا، بانو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں، بانو نے کہا،

آپا جان ، ابّا موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے کتنے چمکدار اور اچھے معلوم ہوتے تھے ۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے !!

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو بانو سے عشق تھا، چنانچہ بالکل آخری زمانۂ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے بہلتا اور بانو بھی مرحوم سے اس طور پہ وابستہ ہوگئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں ، اس کی ہمجولی اور اس کا کھلونا سب ہی کچھ تھے ۔ اسی سلسلہ میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کر لی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرہ میں بانو تک کا آنا بند کر دیا ۔ ایک بار اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آگئی جہاں کوئی اور نہ تھا ۔ میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بانو ڈاکٹر اقبال کے سینہ پر بیٹھی ہوئی بے تکلف بات کئے جا رہی ہے میں گھبرا اٹھی ، سر اقبال کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی ۔ میں نے دبے پاؤں قریب جا کر بانو کو بہلا کر جدا کرنا چاہا ۔ سر اقبال بول بھی نہیں سکتے تھے ۔ بڑی ہی نحیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی تقریباً بند آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بانو کو ذرا دیر کے لیے جوں کا توں رہنے دیا جائے بانو کے اس طرح موجود رہنے سے جیسے ان پر ایک گونہ اطمینان سا طاری تھا اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوئی قندیل کو وہ اپنے جذبۂ امتنان و مسرت سے ایک لمحہ کے لیے اور اجالے اور روشن کئے ہوئے دکھنا چاہتے تھے !

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو ان کا گریہ گلو گیر ہو جاتا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف النسان نہ دیکھا جب میں پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب پُورے کپڑے پہن کر آئے اور انھوں نے دستر خوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کو مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہُوا کہ انھوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لُطف سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو اس تکلف سے مستثنیٰ کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ صرف بنیان اور تہمد پہنے کھانے پر چلے آتے۔ جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا تو کمرہ ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسا کرنے کا عجیب مادّہ تھا۔ میری کسی تجویز کو انھوں نے کبھی رَد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اکثر فرمایا کہ تمھارے ہونے سے مجھے گھر اور بچّوں کی طرف سے ایسا اطمینان آرام ہے جس کا میں بڑا متمنّی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہُوا شاہی مسجد کی پائیں باہیں سمت اس مردِ قلندر کو آسودۂ خاک پایا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اُس اقبال کی آرام گاہ ہے۔ ؎

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے
اور آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی پُراسرار دبدبہ وقار ضخامت
قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات ذہن و دماغ پر اس درجہ اور
اتنا جلد مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل
ہی نہیں رہ جاتا چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبال
کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہیئے تھا۔ جہاں اقبال کے تصور
میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نہ ہوتی۔

اقبال زندہ تھے تو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر
اُن سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ اُن سے کوئی نہ کوئی بات ایسی
ضرور معلوم ہو گی جو میرے ذہن کی استعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے
ولولوں کو بڑھائے گی۔ ذہن کی کچھ اُلجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین
تھا کہ ڈاکٹر اقبال اُنھیں سلجھا دیں گے۔ کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے
کے لیے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے۔ کسی دن ڈاکٹر
اقبال سے جا کر اپنا اطمینان کر لوں گا۔

جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصورات
جن میں بعض دُھندلے تھے اور بعض گریزپا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری
زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اُٹھ جانے سے سب کے سب
درہم برہم ہو گئے اب نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ
یہ امید کہ اقبال جیسا رفیق و رہبر ملے گا جو اُن کی تشکیل و تزئین میں مدد
دے گا۔

اقبال کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ وہ اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے کہ اس ایک بات سے بے شمار نئی نئی اور عجیب باتیں از خود بر آمد ہونے لگتی تھیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اُن کی اس ایک بات سے بہت سی دوسری باتیں نکال سکتا تھا پھر لطف یہ کہ یہ دوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہِ راست نہیں رکھتی تھیں۔ اُن کی بتائی ہوئی باتیں نہ صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ اُن راستوں پر مجاہدانہ و مجتہدانہ انداز سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا تھا۔

اقبال دوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ نہ ہوں میرے لیے تو وہ بہت کچھ تھے۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں اگر یہ شاعری ہے تو پیمبری کیا ہے؟ اور یہ پیغمبری ہے تو شاعری کا کیا درجہ ہے ؟

احسن مارہروی (مرحوم)

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں (میر)

مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبۂ اردو میں سالہاسال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو آن سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر ان کا نام بڑی عزت و محبت سے لیا جاتا تھا ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اردو دان طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم

تھے اور اس بارہ میں اُن کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولانا قدیم مسلکِ شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کے ان لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو اُن کے پیش روؤں سے اِن تک پہنچی تھی۔ بایں ہمہ وہ اُردو ادب شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصوّرات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار۔ اس نئے دبستان کے نقطۂ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے۔ خواہ شاعر کا مسلک اُن کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اُردو میں مغربی انداز کی تنقید اُن کے سامنے مروج و مقبول ہوئی وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجّہ اور شوق سے سُنتے۔ اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامّل نہ کرتے۔ اُردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا مولانا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے، اپنے خیالات و تصوّرات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے دوسرے کے نقطۂ نظر کو توجّہ اور صبر کے ساتھ سُننے میں بے نظیر تھے۔ اس اعتبار سے ان کو "ترقی پذیر" اور ترقی پسند قرار دینے میں تامّل نہ کرنا چاہیئے۔ ترقی پذیر یا ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جراُت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سنیئے۔

رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹھ [66] کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور مسائل کو منقح

کرنے کے بڑے دلدادہ تھے جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اُس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرا ہوا۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے مطلب برآری نہ ہوئی تو بلا کسی لحاظ و تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی اُدھیڑ بن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہو گئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے۔

اس بارۂ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سعی و جستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات جرمن پروفیسر کرنکو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لیے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم متبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کر کے بتائیں گے۔ جب بات منقح ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے۔

پروفیسر کرنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے، بوڑھے

ہنس مکھ، بات کرنے کے شائق، متوسط جسم، لمبا قد، عینک لگائے ہوئے اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لیے ضرور لائبریری پہنچتے ہیں۔ پروفیسر کرنکو کو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب رکھتے ہوئے پاتا۔ گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اُسے مخاطب کرکے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی اس کا خلاصہ سُنا کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار (MODEL DELUXO) کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ آدمیوں سے کم نہ تھی !!

باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر احسن مرحوم ہی کے سپرد کیے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھتے، کہتے تھے اُستاد داغ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث یا محل استعمال کے بارے میں اُستاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ اُن الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ اُستاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات

باہر سے شعبۂ اُردو میں آتے اُن پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قولِ فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اُردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق و محنت سے جمع کرتے۔ کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں تامّل نہ کرتے۔ مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے۔ اُن کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں، نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے اُن میں ان سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام۔ کہتے تھے زبان کی غلطی کیسے سُن لوں۔ ساری عمر اسی میں گزاری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ پاسُن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کبھی تکلف یا تامّل سے کام نہ لیتے۔ ایک دن شعبۂ اُردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورداسپور میں ریلوے میں ملازم تھے۔ مسودات کا بستہ ساتھ تھا۔ اُردو شعرا کا ایک مبسوط تذکرہ مرتب فرمایا ہے

تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ عزیز نے ملازمت کس محکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے۔ ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی اثنا میں مرحوم تشریف لائے۔ نووارد سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولانا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسودہ کی طرف مائل ہوں۔

مولانا نے مطلقاً التفات نہ کیا۔ اس سے نہ تو نووارد کی دلجمعی ہوئی اور نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کو اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی۔ مولانا نے کسی قدر اکتا کر مسودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اُردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ کہہ کر مسودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں مولانا نے بغیر ان کی طرف رخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کیا دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی۔ مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، آپ کا کیا، کانا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف ہوئے۔ میں نے عرض کیا مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں فرمایا کون صاحب

ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چاہیں تو چائے مفت میں پلوادیں!

مولانا بے ساختہ ہنس پڑے اور نو وارد سے بہت کچھ التفات فرمایا اور بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سمائی نہیں۔ اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا کروں شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا۔

ایک بار ایک دوست نے مولانا کو اپنا انتہائی راز داں سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنایا تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے۔ عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بد نصیبی سے مولانا کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب "سینۂ بسمل سے پرافشاں" نکلنا چاہتا ہے۔ میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولانا سُنی اَن سُنی کرتے جاتے تھے اور جب انھیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انھوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھرکم جسم کو اس طرح تولایا جس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور تکان میں آنکھ پھونکیں مارتا ہے ایک دفعہ ادھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میرے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا۔

میں اُن کے ارادہ سے واقف ہوگیا۔ میں نے بھی ایک لمبا سانس
لے کر اپنی کرسی اُن سے اتنی ہی دُور کر لی۔ جتنی اُنھوں نے قریب کی تھی۔ مولانا
کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ اُنھوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال
نہ کیا اور نفسِ مضمون پر آنے کی جدّوجہد شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس
دفعہ پسپا نہ ہوں گے۔ چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہِ فرار اختیار کی
اور اُٹھ کر بھاگا۔ مولانا باآں جسدِ عنصری میر التعاقب بھی نہ کر سکتے تھے اس
لیے اُنھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے فرمایا۔ رشید صاحب ارے وہ بھی سُنا۔ میں بھاگنے
کی سائنس و آرٹ یعنی (REAR GUARD ACTION) ریر گارڈ ایکشن
(جنگِ پسپائی)[1] سے پوری طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے
جواب دیا جی ہاں مولانا میں ابھی آتا ہوں۔ مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا
ہے میں دروازہ سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر
آخری گولی چلا ہی دی۔ میں گر گیا۔ مولانا نے راز فاش کر دیا تھا۔

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سیّد شاہ برکت اللہ
علیہ الرحمۃ سترھویں صدی کے آخر یا اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے
مارہرہ تشریف لائے اور اس خاندان کے بانی ہوئے۔ چنانچہ مرحوم کی خاندانی

---

[1] اس سلسلہ میں غالب مرحوم کا ایک شعر آپ کو یاد ہوگا ؎

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جا پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے!

عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور مشہور ہے مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور پر وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا۔ مولانا کے قریب جا کر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے ان کی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے کرتے پاجامے، سر پر بال باریک ترشے ہوئے، پاؤں میں جوتا، سر پر ٹوپی، چلنے پھرنے ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شستگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور

سنوارنے ننگے سر پھرنے یا انواع و اقسام کے نیکر اور قمیص پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آزادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ مولانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے۔ بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ یہ قل اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں، لیکن نسوانیت یا شہدپن کے مقابلہ میں قل اعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دے سکتا۔ لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لیے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور مردوں کے لیے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے۔ پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں۔ نہ ان کو ملزم قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے، نئی زندگی و نیا زمانہ مجموعۂ صد کرامات سہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے تجربہ و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی انسانوں اور انسانیت کے لیے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔

مرحوم پرانی دنیا کے آدمی تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چولیں سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور زیادہ نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور

جدید ترین آلات وعلوم تھے، مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے۔ ہر جگہ ان کی پزیرائی خوش دلی سے کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بہت بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے اور تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں، عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ جیسی کر گزرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کرچکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب فقرے بھی چست کرتے تھے ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا۔ بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اور اب جب کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم وجان کو اکٹھا رکھنے میں تماشائے اہلِ کرم دیکھنا چاہوں تو معترض کیوں ہوتے ہو۔!

مرحوم شاعری کے قدیم دبستاں کے پیرو تھے ساری عمر شعر و شاعری تصنیف تالیف، تحقیق وتدقیق میں گزار دی۔ اپنے استاد کے مسلّم الثبوت پیرو تھے لیکن کلام میں استاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی شوخ رنگینی وجدت

آفریدی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا زبان محاورہ و مصطلحات و متعلقات شاعری کے سمجھنے، پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اٹھتے جا رہے ہیں۔ صحت زبان و مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس برتے پر کرے شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں فنی تبحر بڑی اہم چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے اس لیے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گزرا ہے شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیٰ حضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحہ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولانا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا۔ عالم یہ تھا کہ شعبۂ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلبا اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے

کہ مثنوی مکمل ہو گئی مولانا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیش نظر ہوں۔

ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے برسبیلِ تذکرہ فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا۔ جب مصرع طرح دے دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ مولانا مرحوم یہ سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔ آواز میں لکنت تھی اس لیے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے تو ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا تھا۔ ململ کا ڈھیلی آستین کا کرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستین چڑھالی اور بڑے سے ہی کرخت تیور سے بولے۔ میاں ہوش میں آؤ کہ کیا بک گئے شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پر پڑیں تابڑ توڑ جوتے اس وقت مصرع طرح دو۔ پھر دیکھیں کون کتنے پانی میں ہے۔

مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعراء کے صدر ہیں۔ اگر مجوزہ آداب آئندہ سے نافذ کر دیے جائیں تو کیا ہو۔ مرحوم قہقہہ مار کر کرسی پر لیٹ گئے۔ کہنے لگے، بڑا اچھا ہو، کم بخت گویوں سے نجات ہو جائے!

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں "فصلی" میں کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے کھنچ کر آتے ہیں اور صید و صیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے یہاں ایک سالانہ مشاعرہ ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے سامنے کی صفِ اول میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں یکہ بازوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرع مجھے اب تک یاد ہے۔؎

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی۔ بھلے مانسوں کے سیدھے سادے لب و لہجہ میں یہ رُباعی پڑھی ؎

ساز ندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن
بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سُننے والے اُچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی۔ جس کے اس شعر پر کہ صفِ اول کو مدِ نظر رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرۂ تحسین و تہنیت بلند ہُوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی ؎

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت
یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف و انہماک سے اس کا اہتمام کرتے تھے اور شعراء و مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تقریب منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے دو ایک دن بڑی چہل پہل کے گزرتے ہر شاعر کا پورا پورا حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا۔

اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا۔ چنانچہ رخصت لے کر بمبئی گئے۔ وہاں احباب اور قدر دانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اُس زمانہ میں یہاں پر وہ اُس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دیئے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولانا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبۂ اُردو کی بھی خیر نہیں۔ میری طلبی ہوئی۔ مکالمہ سنیئے:۔

صاحب۔ (لال بھبھوکا ہو کر اور مع کرسی میری طرف رُخ کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

میں۔ (متعجب و سراسیمہ ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے، جناب؟

صاحب۔ (تقریباً دانت پیس کر) بے شک۔ مولانا صاحب نے کیوں درخواست

دی۔ ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض سے اُنھوں نے غفلت برتی !!

میں ۔ جنابِ والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ اُنھوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہیئے۔

صاحب ۔ (نہایت غصّہ ناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر گئے کیوں ؟

میں ۔ شعر پڑھنے !

صاحب ۔ شعر !

میں ۔ شعر، جنابِ والا !

صاحب ۔ اپنے شعر ؟

میں ۔ مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب ۔ ہُوا کیا ؟

میں ۔ ہونا ہوانا کچھ نہیں عالی جاہا، لیکن مانتا کوئی نہیں۔

صاحب ۔ تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے ؟

میں ۔ جنابِ والا میں نالائقی تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب اُن سے بھی گفتگو فرمالیں۔ بہت سی باتیں واضح ہو جائیں۔

صاحب ۔ بہت خوب، مولانا صاحب کو میرے ہاں لاؤ (کسی قدر زہر خند فرما کر) مجھے اب تک اُن سے ملنے کی مسرت بھی نصیب

نہیں ہوئی ہے۔

پرو وائس چانسلر صاحب کو مولانا کی واپسی کی اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی۔ میں اور مولانا حاضر ہوئے۔ مولانا کو دیکھ کر صاحب بلکلف جھجکے اور فوراً ہی سروقد ہوکر تعظیم دی۔ انتہائی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ البتہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجالانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے، یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سروقد کھڑے ہوگئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا۔ لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہوگئی۔

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلّم بن کر پڑھاتے تھے۔ اور طالب علموں سے اُن آداب کی توقع رکھتے تھے۔ جو خود مرحوم نے اپنے اُستادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے آزردہ و برہم چلے آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آ گئے۔ معلوم ہوا کہ بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے تھے۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔ معاملہ رفت گزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو

ہوئی ۔ فرمایا رشید صاحب! طلبا پڑھنے نہیں آتے ۔ وقت گزاری اور تفریح و تفنن کے لیے آتے ہیں ۔ یہ دُنیا میں جو چاہے کرلیں علم تو ان کو آنے کا نہیں! میں نے عرض کیا۔ مولانا، آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجیے گا۔ یہ طلبا کا قصور نہیں ہے ۔ دُنیا کا یہی رنگ ہے ۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدر و قیمت رکھتی تھیں وہ اب مردود ہو چکی ہیں ۔ حفظِ مراتب اُٹھ چکا ہے ۔ یہ زمانہ احتسابِ نفس کا نہیں ہے مطالباتِ نفس کا ہے ۔ کڑھیے نہیں ۔ لڑکوں کو معاف کر دیجیے ان کو نہیں معلوم وہ کیا کر رہے ہیں ۔ اور کن اثرات کے شکار ہیں ۔ مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا ۔ بولے جی نہیں ۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجیے ۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا ۔ میں نے عرض کیا مولانا فرض کیجیے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں ۔ آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجیے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجیے آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کرتے ہیں ۔ مولانا دھیمے پڑ گئے اور کسی قدر مدھم سروں میں انا للہ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے ۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا ۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے! اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے ۔ برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے تھے لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو درکنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے ۔ ذیابیطس کے

پرانے مریض تھے لیکن اس کی بالکل پروا نہ کرتے تھے اس وضعداری نے کاربنکل سے دوچار کیا اور کاربنکل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعاد عمر ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام کیا کرتے تھے جو ان سے بہت کم عمر والوں کے لیے مشکل تھا۔ ان کے قوا ذہنی و جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ رندوں میں رند پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں بزرگ، کیسے کیسے زمانے کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوئے، یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۳۰ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہنچ گئی۔

اگست سنہ ۱۹۴۰ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا، مکان سے یونیورسٹی آ رہا تھا کہ خبر ملی مولانا احسن کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے اور کیوں حضور سنتا ہوں "خنداں" شائع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لیے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجیے پڑھ کر واپس کر دوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب، کہاں ایک معمولی کتاب کی طلب اللہ اکبر! میں مبہوت ہو گیا اور ایک لمحہ کے لیے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان و زمین

کی ساری پہنائیوں پر مریض کی شخصیت مستولی ہوگئی۔ میں تھوڑی دیر تک
دم بخود رہا لیکن مرحوم چھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پانے تو بھی
کہنے رشید صاحب خدا را کتاب بھجوا دیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں۔
وہ لے آئیگا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں! عجب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا
اور نہ مولانا کو مل سکی ؎

سید محفوظ علی

یہ تقریر "گدڑی کے لعل" کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی تھی۔ بعد نظرِ ثانی اس مجموعہ میں پیش کی جاتی ہے۔

مرتب

"سید محفوظ علی صاحب" بی اے علیگ کا ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو انتقال ہو گیا۔

گدڑی کا یہ لعل بدایوں کی مردم خیز زمین سے اُٹھا اور کم و بیش ۷۳ سال کی خزاں و بہار لیے ہوئے لالہ و گل میں نمایاں ہونے کے لیے بدایوں ہی کی خاک میں پنہاں ہو گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ تقریر جو اُن کی زندگی پر اور اُن کی زندگی

میں ہونے والی تھی - آج "خطبۂ میت" بن جائے گی - جو لوگ مرحوم سے واقف نہیں وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ پروانہ کی یہ خاک کس رونقِ محفل کی یادگار تھی -

مرحوم علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے اور مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ساتھیوں میں تھے - بڑے بھائی سے چھوٹے اور چھوٹے سے بڑے، حیدر آباد میں مولوی عزیز مرزا، مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شرر مرحومین کی صحبتیں دیکھ چکے تھے - یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ ایسی ہستیوں کا گہوارہ تھا جن کے نام اور کام کی شہرت اب بھی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں گونج رہی ہے - سید صاحب کا علی برادران سے اوائل طالب علمی ہی سے نہایت گہرا اور مخلصانہ تعلق رہا جو بریلی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس سے شروع ہو کر علی گڑھ کالج پر ختم ہوا، مولانا محمد علی، سید محفوظ علی سے چھوٹے تھے - اتنے چھوٹے کہ سید صاحب ان کی گوشمالی بھی کر دیتے تھے - مولانا محمد علی کو گوشمالی ہی نہیں بلکہ انگلش کا جو ملکہ حاصل ہو گیا تھا معلوم نہیں اس میں اس گوشمالی کو کس حد تک دخل تھا -

سید صاحب نے عربی، فارسی میں تکمیل کرنے کے بعد انگریزی کی طرف رجوع کی - انگریزی کے مدارج ۱۸۸۸ء تک علی برادران کے ساتھ بریلی میں طے کئے اور ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ آئے اور ۱۸۹۵ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد سید محمود مرحوم کی وساطت سے دربارِ خیرپور پہنچے ۱۸۹۶ء سے سلسلہ ملازمت شروع ہوا ۱۹۰۱ء میں سندھ کو خیرباد کہہ کر بمبئی

آگئے وہاں سے جلد ہی ترجمہ کی خدمت پر مامور ہو کر حیدر آباد پہنچے ۱۹۰۴ء
میں علی گڑھ کے مشہور پرنسپل سر مارلیسن کے ایما سے سومالی لینڈ (افریقہ)
میں جج کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہاں سیّد صاحب نے اپنے فرائض جس دلیری
اور خوش اسلوبی سے ادا کئے اس کا تذکرہ اس موقع پر نظر انداز کیا جاتا
ہے۔ ۱۹۰۷ء کے بعد ہندوستان آئے اور آخر وقت تک وطن میں رہے
یا مولانا محمد علی مرحوم کے پاس دہلی میں ہمدرد کا کام سنبھالتے رہے۔

مولانا محمد علی کو سیّد صاحب سے جو دلی شغف تھا وہ شروع سے آخر
تک قائم رہا۔ کامریڈ اور ہمدرد کا خواب دونوں نے مل کر دیکھا تھا اور
اس کی تعبیر و تشکیل میں دونوں شریک رہے۔ ایک صحرا کو نکل گیا۔ دوسرا
بدایوں کے گلی کوچوں میں بھی رسوا نہ ہوا۔ مولانا محمد علی کے مزاج میں جو
بے پایاں شدّت و حرارت تھی جس نے ان کو ہمیشہ نعل در آتش رکھا
جس کی وجہ سے کوئی شخص مولانا کے ساتھ یکسوئی اور استقلال کے
ساتھ کام نہ کر سکتا تھا اور جس تپش و طوفان کے بالآخر وہ خود نذر ہو گئے
اس نے سیّد محفوظ علی کو کبھی متزلزل نہ کیا۔ سیّد محفوظ علی نے اس مہر
نیم روز سے روشنی اور حرارت بھی اکتساب نہ کی۔ محفوظ علی اپنے نظامِ
شمسی خود تھے۔

مولانا محمد علی کامریڈ اور ہمدرد کا دفتر کلکتہ سے اور سیّد محفوظ علی کو
بدایوں سے دلی لائے اس زمانہ میں ہمدرد میں مضامین کا ایک سلسلہ
"تجاہلِ عارفانہ" کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوا جس کے مصنّف سیّد صاحب

تھے۔ یہ مضامین اس زمانہ میں اخباری طنز و ظرافت کا اعلیٰ نمونہ قرار دیئے گئے۔ مولانا محمد علی اور ولایت علی بمبوق کے مضامین دیکھنے کے لیے لوگ جس طرح کامریڈ کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ تجاہلِ عامیانہ کے مطالعہ اور پذیرائی کے لیے ہمدرد کے منتظر و مشتاق رہتے تھے "تجاہلِ عامیانہ" میں اس زمانہ کے سیاسی اور معاشرتی مسائل پر بڑی لطیف تنقید ہوتی تھی تجاہلِ عامیانہ کی تقلید میں مدتوں مضامین لکھے گئے اور سید صاحب کا یہ تصرف عرصہ تک ہمارے انشا پردازوں کے ذہن و قلم پر کارفرما رہا۔

سید محفوظ علی میں وہ تمام صفات نہ تھی موجود ہو باتیں جن کا یہاں احاطہ کرنا نہایت مشکل ہے تو میرے نزدیک ان کی یہ صفت سب سے اونچی تھی کہ انھوں نے اس زمانہ میں بھی شہرت نہ چاہی جب شہرت بڑی مشکل سے حاصل ہوتی تھی لیکن وہ بڑی آسانی سے مشہور ہو سکتے تھے۔ اور اب جبکہ شہرت ماری ماری پھرتی ہے وہ تقریباً گمنام ہو گئے تھے۔ میر صاحب کے بیشتر مضامین فرضی ناموں سے شائع ہوئے کبھی ملا لودھاموی کے نام سے کبھی شمع بے نور اور کبھی آق سفال کے نام سے یہ بھی ایک سبب ہے کہ میر صاحب کو عام طور پر لوگوں نے بہت کم جانا پہچانا۔ ہر بڑی شخصیت اور ہر بڑے کارنامے کے پیچھے عام نظروں سے اوجھل بظاہر ایک نہایت معمولی اور ناقابلِ التفات لیکن دراصل نہایت پختہ کار ہستی ہوتی ہے اور اس کو تقویت بھی پہنچاتی رہتی ہے۔ یہ ہستی جدال و قتال کے میدان اور عیش و طرب کی محفل دونوں سے علٰحدہ رہتی ہے لیکن میدان و محفل دونوں میں اسی کا

عمل دخل پوشیدہ رہتا ہے۔ ایک مدّت تک مولانا محمد علی پر سیّد محفوظ علی کا اسی قسم کا اثر اور تسلّط رہا۔ سیّد صاحب کے درجہ کو متعیّن کرنے کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ مولانا محمد علی، سیّد محفوظ علی سے بے جھجک ہونے کی کبھی ہمّت نہ کر سکے۔ جو لوگ مولانا محمد علی کی بُت شکنی اور خود شکنی سے واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سیّد کا وہ کون سا سکوت ساحل تھا جو سمندر کی سطوت سے باخبر بھی تھا اور بے پروا بھی۔

علی گڑھ پر سے ترکِ موالات کا سیلاب گزر چکا تھا۔ موجودہ مسلم یونیورسٹی سے قریب ہی ایک وسیع بنگلہ میں مولانا محمد علی نے جامعہ اسلامیہ قائم کر دیا تھا۔ ایک بڑے ادارے کو وجود میں لانے کے لیے وہ بھی ایک بڑے ادارہ کے مقابلہ میں مولانا محمد علی ایسی بے پناہ ہستی کم سے کم مدّت میں جو کچھ کر سکتی تھی اور جو کچھ نہ کر سکتی تھی وہ سب موجود تھا ہر طرف ہر قسم کے آدمی اور ہر طرح کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ ایک دن میں بھی جا نکلا، کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا کہ کیا ہنگامہ بپا تھا۔ جب اس تمام ہنگامہ کا مرکز مولانا محمد علی کو قرار دے دیا جائے۔ مولانا بیک وقت طلباً، علماً، والدین، باورچی، ٹھیکہ دار، قلی، تھانہ دار، اخبار کے نامہ نگار، کوّے، کتے، فقیر، خوانچہ والے سے مصروفِ کارزار تھے۔ اس رستخیز میں ایک طرف چاندنی کے فرش پر، سکوت اور متانت کے ساتھ ایک بزرگ دوزانو بیٹھے ہوئے نظر آئے، چھوٹا سا قد، مختصر جسم کوٹ و تسلیم میں ڈھلی ہوئی سفید گول مختصر سی داڑھی۔ آنکھوں میں بچّوں کی معصومیت جوانوں کی تازگی

اور صاحبِ کرامت کی تب و تاب لیکن بحیثیتِ مجموعی مہر و وفا کی نرمی و نزاکت میں ٹھٹھک سا گیا اور گرد کا سارا ہنگامہ دل سے محو ہو گیا۔ یہ میر محفوظ علی تھے!

میر صاحب کی خلقی شگفتگی و ملاطفت سارے ہنگامے پر غالب تھی پریس کا کام بھی جاری تھا۔ کاپی اور پروف چلے آ رہے تھے کچھ لوگ ترجمہ کا کام کر رہے تھے وہ بار بار میر صاحب سے رجوع کرتے تھے بعض قلمی نسخوں کی تصحیح و تحشیہ میں مصروف تھے۔ وہ میر صاحب کے پاس آتے جاتے تھے۔ میر صاحب ہر ایک کو برجستہ اور بڑے لطف سے مطمئن کر دیتے تھے۔ اس درمیان میں کبھی کبھی مولانا محمد علی بھی گرجتے برستے ادھر نکل آتے تھے۔ میر صاحب کے پاس پہنچتے ہی یہ "شمشیر دستاں اول طاؤس و رباب آخر" میں تبدیل ہو جاتا تھا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے یہ شعلہ و شبنم کا قران بھی دیدنی تھا!

میر صاحب کی عربی فارسی کی قابلیت کا لوہا خود ان کے اُستاد طالب علمی کے زمانہ میں مانتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور اور ہر ماخذ پر سید مرحوم کو پورا عبور تھا۔ مولانا محمد علی بھی تاریخ کے بڑے جید طالب علم تھے اور اس بارہ میں سید صاحب کی علمی معلومات اور مورخانہ تعبیروں پر بڑا اعتماد کیا کرتے تھے۔ اسلامی علوم میں سید محفوظ علی کو بڑا درک تھا، اس جہت میں بھی مولانا محمد علی ان کے قائل تھے۔ مولانا محمد علی کا "بحثنا" بھی ایک جاودانہ ہوتا تھا اس پر سید صاحب کا مسکرانا اور چپکے سے کوئی لگتی ہوئی بات کہہ دینا

اور اس طور پر کہنا کہ مولانا کا جو ہاتھ گرز بن کر اٹھا تھا وہ سید صاحب کے گلے میں حمائل ہو جاتا۔ آخر عمر میں سید صاحب نے تفسیر کلام پاک کا ایک مخصوص اور مختصر حلقہ اپنے ہی گھر پر اپنے احباب اور عقیدتمندوں کے لیے قائم کر لیا تھا جو لوگ کلامِ پاک کی تفسیر و تعبیر کی نزاکتوں کو جانتے ہیں وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ سید صاحب نے یہ کام کس بل بوتے پر شروع کیا تھا اور اس سے ان کی فضائل علمی اور وارداتِ قلبی پر کیا اور کیسی روشنی پڑتی ہے۔

برمحل اشعار پڑھنے اور پیش کرنے کا جو کمال میں نے مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد میں پایا وہ کہیں اور نہ ملا۔ معمولی سا شعر بھی کسی موقع پر پیش کر دیا کرتے ہیں تو موقع کی مناسبت اور استعمال کی برجستگی سے خود شعر کا پایہ بلند ہو جاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی بل کی موافقت و مخالفت میں دو گروہ بن گئے تھے۔ مخالفین میں مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی تھے کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ مولانا محمد علی بل کی موافق جماعت میں شریک ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس واقعہ پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان یہ شعر تھا ؎

معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

مولانا محمد علی نے مضمون دیکھا تو تلملا اٹھے، برق و باد بن کر سید محفوظ علی کے پاس پہنچے۔ دروازہ اس طور پر کھٹکھٹایا جیسے مکان کی چھت گرا اور بنیادیں ہلا دیں گے۔ سید صاحب کو پا کر بولے ابوالکلام کے شعر کے

جواب میں کوئی شعر بتاؤ۔ سیّد صاحب نے پوچھا کیا شعر ہے اور کس موقع پر پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے جلدی جلدی شعر سنایا اور مضمون کی نوعیت بتائی۔ اس دوران میں سیّد صاحب کو جھنجھوڑتے بھی رہے۔ سیّد صاحب نے برجستہ کہا کھو سہ

برکفِ جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق!
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

مولانا جھومنے لگے۔ بولے معرکہ سر ہو گیا۔ اس موقع پر مولانا نے اعتراف کیا کہ اس بارہ میں سیّد کا دماغ کچھ کم رسا نہیں ہے!

گزشتہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں مولانا محمد علی کا ایک معرکۃ الآرا مضمون CHOICE OF THE TURKS شائع ہوا تھا اس کا ترجمہ اردو میں کیا جا رہا تھا۔ بحث یہ تھی کہ CHOICE کا اردو مترادف اس موقع پر کیا ہوگا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا تھا لیکن اطمینان کسی کو نہ ہوتا۔ بالآخر یہ مسئلہ سیّد صاحب سے رجوع کیا گیا، سیّد صاحب نے موقع محل دریافت کر کے فوراً بتایا "چارہ کار" ظاہر ہے اس موقع پر چارہ کار سے بہتر کوئی اور لفظ ہو نہیں سکتا۔

سیّد صاحب ہمیشہ اور ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے اور تقریباً ہر موضوع کو نامکمل چھوڑتے یہ کسی معتقد کا کمال ہی ہو تا کہ وہ سیّد صاحب سے مکمل مضمون حاصل کر لیتا۔ نامکمل مضامین کا ایک مینا بازار ان کے صندوق میں مقفل ہے دیکھیے کب اور کس کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ وہ ان کو مرتّب اور مدوّن کرتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اردو میں طنز و ظرافت کو پھکڑ اور

فحاشی سے نکال کر خاصہ کی چیز بنانے میں سیّد مرحوم کا بڑا حصّہ ہے سیّد صاحب کا دماغ حاضر اور ذہن رسا تھا۔ وہ زندگی کے اُن پہلوؤں کو فوراً تاڑ لیتے تھے، جن پر طنز و ظرافت کا وار ہو سکتا تھا۔

سیّد صاحب کی ظرافت میں ایک طرح کی (BUOYANCY) ملتی ہے "بعضوں کی ظرافت" ٹھوس اور ٹھس" جیسے پانی میں سیسے کا ٹکڑا گر کر تہ نشین ہو جائے۔ بعضوں کی سیّال ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر پھیل کر فضا میں غائب ہو گئی۔ سیّد کی ظرافت کی مثال کنول کے پھول سے دے سکتے ہیں۔ پانی کا اُتار چڑھاؤ کیسا ہی ہو پھول برابر شگفتہ جھومتا اور تیرتا رہے گا۔ ان کی ظرافت میں ان کی شخصیت اجاگر رہتی ہے۔ وہ الفاظ سے بھی کھیلنے کے شائق تھے۔ اُن کے ظریفانہ مضامین میں "رعایات و مناسبات" کا اچھا خاصا عنصر ملتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اب قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی لیکن وہ ان رعایات کو رعایت کی خاطر بہت کم استعمال کرتے تھے وہ ان میں "موقع و ماحول" کا ایسا رنگ بھر دیتے تھے کہ ان میں واقعیت جھلکنے لگتی تھی۔ ایسی واقعیت جو آرٹ میں جان پیدا کر دیتی ہے۔

" شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سیّد کے ذہن کی دراکی اور قلم کی شگفتہ کاری کس کس طرح سے اور کن کن نازک اور دقیق ملحوں میں بروئے کار آئی ہے۔ سیّد کا دور اودھ پنچ اور رعایات و مناسبات لفظی کے فوراً بعد کا دور ہے اس لیے سیّد اور

ان کے پیشروؤں کی صناعی و صنعت گری میں ربط ملتا ہے۔ البتہ یہ سید کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے پیشروؤں کے ادنیٰ اور زوال پذیر ٹکنک کو ترقی دے کر اس طور سے ختم کر دیا کہ اس میں مزید ترقی کی گنجائش باقی نہ چھوڑی لیکن سید کو جو چیز ایک طور پر ترکے میں ملی تھی اس کو انھوں نے ادبی و فنی نقطۂ عروج تک پہنچا کر بس نہیں کیا بلکہ "رعایات و مناسبات" سے گزر کر مبصرانہ ظرافت کی تخلیق کی اور ظرافت کے تانے بانے میں طنز کی ایسی بوقلموں دھوپ چھاؤں پیدا کر دی کہ فن کے ترقی کے امکانات بہت زیادہ وسیع ہو گئے۔ "صاحب دین" میں اس مبصرانہ ظرافت کے بڑے اچھے نمونے ملیں گے۔

سید کی انشا پردازی کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان کو عورتوں کی صحیح و شستہ زبان لکھنے کا بڑا ملکہ تھا اور وہ اسی زبان میں بڑے پتے کی باتیں بڑے لطف سے بیان کر جاتے تھے۔ عورتوں کی زبان لکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا اس زبان میں اہم اور مشکل باتوں کو خوبی اور خوبصورتی سے سمونا مشکل ہے۔ شیخ سماء اللہ کی صاحبزادی پر جو مضمون سید صاحب نے لکھا ہے وہ ان کے گہرے مطالعہ اور صناعانہ چابک دستی کی بڑی اچھی مثال ہے سارے مضمون میں ایک طرح کی ڈرامائیت جاری و ساری ملتی ہے۔ اس طرح کے مواد کو اس انداز سے ڈھالنا اور یہ آب و رنگ پیدا کرنا ہمارے ادب میں مدتوں یاد رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اصلی معنوں میں صحیح اور اچھی اردو لکھنے کے شائق ہوں اُن کو ہماری عورتوں کی زبان کا شوق اور سلیقہ سے ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ بغیر اس کے زبان کی روح تک

رسائی بہت مشکل ہے۔ عورتوں کی اس زبان میں وہ تمام عناصر و عوامل بہترین "ترکیب" میں ملتے ہیں جو ہمارے تمدن میں کبھی قابلِ فخر سمجھے جاتے تھے۔

کئی سال ہوئے ایک سلسلہ میں بدایوں جانے اور سید صاحب کا مہمان بننے کا اتفاق ہوا۔ شاید ۲ دو روز ٹھہرنا پڑا تھا۔ مہمان نوازی کے بارہ میں تو مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ کسی مسلمان کا یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہوتا یہ تو اس کی عرب سرشت میں داخل ہے۔ مجھے جو چیز سید صاحب کی نہایت درجہ دلکش معلوم ہوئی وہ ان کی ذہانت و شگفتگی تھی جس میں محبت اور نفاست کا عجیب امتزاج ملتا تھا۔ ایک مصور یا نقاش کسی مثالی تصویر کے بنانے میں جس امید، حوصلہ، سلیقہ اور شغف کو بروئے کار لاتا ہے۔ سید صاحب وہی باتیں اپنے مہمان کے لیے روا رکھتے تھے۔ وہ دوسرے کاموں میں پورے طور پر منہمک ہوتے تھے لیکن مہمان کو ایک لمحہ کے لیے نہیں بھولتے تھے۔ یہ بات اتنی واضح ہوتی تھی کہ موٹی سے موٹی عقل والا مہمان بھی سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا تھا۔

ان کی صحبت میں ہر قماش کے لوگ موجود ہوتے جو ذہنی یا سماجی اعتبار سے مختلف سطح پر ہوتے لیکن ان میں سے کسی کو یہ شکایت کبھی نہیں پیدا ہوئی کہ سید صاحب نے کسی کے لیے کوئی کمی یا زیادتی روا رکھی۔ یہی وہ عجیب و غریب ملکہ یا خلوص تھا جس نے سید صاحب کو ہر ایک کا محبوب بنا رکھا تھا۔ بدایوں کے دورانِ قیام ہی میں ایک موقع پر میں نے عرض کر دیا کہ

سیّد صاحب بننے کو تو میں آپ کا مہمان بن گیا لیکن زمانہ پُر آشوب ہے، خدا نہ کرے میرا آپ کا سابقہ کسی اور طرح سے ہو۔ سیّد صاحب کسی قدر متعجب ہو کر بولے کیوں کیوں خیر تو ہے۔ میں نے کہا آپ میری دیکھ بھال اس طور پر کرتے ہیں جیسے آپ کو میری ساری کمزوریاں معلوم ہیں اور یہ بات و بارِ غیر بالخصوص بدایوں میں میرے حق میں کچھ اچھی نہیں ہے۔ سیّد صاحب بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا اس بات پر آپ کو بدایوں کے اصلی پیڑے انعام میں دیئے جائیں گے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ بدایوں سے ریل زیادہ رات گئے روانہ ہوتی تھی۔ رخصت ہونے کا وقت قریب آیا تو معلوم ہوا سیّد صاحب غائب ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں تشریف لائے۔ فرمانے لگے کمبخت دوکان بڑھا گیا ورنہ پیڑے ساتھ کر دیتا۔ خیر یہ پیڑے سیّد پر قرض ہیں۔ میں بہت نادم و متاثر ہوا۔ عرض کیا سیّد صاحب آپ ایسا کریں گے تو میں بدایوں میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔ فرمایا اور میں کب رہا۔ پھر گلے لگا لیا اور اس طور پر ملے جیسے زندگی میں شاید پھر نہ ملنا ہو۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔!

سیّد کی شخصیت کا یہ کمال تھا کہ کوئی کسی ذوق یا مسلک کا کیوں نہ ہو سیّد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ میرے بعض احباب انگریزی تہذیب و معاشرت کے دلدادہ اور انگریزی حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے سبب سے زندگی و زمانہ کا مخصوص تصوّر رکھتے ہیں ان کو مشرقی تصوّرات اور مشرقی آداب بود و ماند سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہاں تک کہ

مشرقیت کا مذاق اُڑانا اپنی طرزِ زندگی کا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ اس قبیل کے ایک دوست بدایوں پہنچ گئے۔ ایک بار علی گڑھ آئے اور اُن سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے سیّد صاحب سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح سے سنایا جیسے زندگی میں ان کو ایسا عجیب و غریب واقعہ کبھی پیش نہ آیا تھا کہنے لگے بھائی یہ سیّد تو کہیں بند نہ تھا۔ اس پر کسی کا رعب ہی نہ پڑتا تھا۔ میں نے ایسا شیریں و شگفتہ بڈھا کہیں نہ دیکھا۔ جو بات جہاں کہہ دیتا اور جتنا برجستہ کہتا وہ کسی کے اُٹھائے نہ اُٹھتی تھی۔ میں نے ایسا باغی نہ دیکھا جس کی کہیں سے گرفت نہ ہو سکتی تھی۔ یہ بڈھا تو ذہین نوجوان اور حسین عورت سے زیادہ کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کے سامنے چپ بھی نہیں رہا جاتا تھا اور بیباک ہونے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سیّد صاحب کی وفات کے بعد دوست کو یہ خبر سُنائی تو دم بخود سے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بولے، بھئی میں ہوتا تو اس کی میت اُٹھنے نہ دیتا۔ مرنے پر بھی اس کی دلبری نہ گئی ہو گی!

مرحوم سید نصیر الدین علوی (علیگ)

سید نصیر الدین علوی مرحوم ہنستے کھیلتے زندہ رہے اور ہنستے ہی کھیلتے اُٹھ گئے آغاز اور انجام دونوں قابلِ رشک۔ میں سمجھتا ہوں ایسے شخص کی عاقبت بھی سب سے نہیں تو بہتوں سے یقیناً بھلی ہوگی۔ میرا اُن کا اسکول میں بھی ساتھ رہا اور کالج میں بھی۔ وہ مجھ سے سینئیر تھے۔ لیکن نصیر صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں نصیر صاحب رہے۔ خواہ وہ اسکول میں رہے ہوں خواہ کالج میں خواہ سب ججی پر فائز۔

گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور میں ہم دونوں پڑھتے تھے۔ میں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا وہ اٹالہ کی مسجد کے پائیں اپنے آبائی مکان میں۔ لیکن دن کا

زیادہ حصہ ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ نصیر صاحب مٹھائی کے بڑے شائق تھے مجھے اس چیز سے کچھ دشمنی نہ تھی گھر پر جب مٹھائی اچھی خاصی مقدار میں جمع ہو جاتی تھی تو مرحوم بشارت دیتے کہ آجاؤ۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا (آج سے کوئی پچیس تیس سال پہلے) نصیر بھائی (مسلم بورڈنگ ہاؤس جون پور میں بڑوں کو "صاحب" کے بجائے بھائی سے مخاطب کیا جاتا تھا) اتنی مٹھائیاں کہاں سے آجاتی ہیں۔ جواب دیا، جنات لاتے ہیں۔ تین چار سال ہوئے مرحوم علی گڑھ تبدیل ہو کر آئے تو ایک دن شکایتاً فرمایا۔ رشید تم آتے نہیں۔ میں نے کہا وہ جنات بھی آتے ہیں یا نہیں۔ بڑے زور سے ہنسے۔ کہنے لگے بھئی پہلے جنات مٹھائی لاتے تھے اب سب کھا جاتے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر مجھے کہاں بلاتے ہیں میں اپنے جنات بھی آپ ہی کے ہاں بھیج دیا کروں گا۔

مرحوم کی زبان میں لکنت تھی اور طبیعت میں بلا کی شوخی اور جولانی۔ کبھی جوش میں آکر یا بے اختیار ہو کر گفتگو کرتے تو ان کا بات کرنے میں اٹکنا اور پھر یکلخت کہہ پڑنا مزہ دے جاتا تھا۔ اسکول میں ہیڈ ماسٹر اور ماسٹروں سے اور کالج میں یہاں کے منتظمین سے الجھے رہنے میں ان کو خاص لطف آتا تھا۔ شوخی، شرارت، خوش طبعی اور وضعداری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اسکول میں ہاکی کھیلتے تھے، کبھی کبھی ٹینس بھی۔ لیکن انھیں کھیل سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنا کھلاڑیوں میں گھلے ملے رہنے کا شوق تھا۔ میں انھیں کے ساتھ الہ آباد کی مشہور نمائش دیکھنے گیا تھا۔ تین چار دن

الہ آباد میں رہے، پاؤں سے جوتا نہیں اتارا۔ پہنے پہنے سو جاتے، لوگوں نے پوچھا یہ کیا حرکت ہے، بولے بھئی بڑا مزہ آتا ہے، لحاف کے اندر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نمائش میں گھوم رہے ہیں!

عرصہ کی بات ہے جب سردیوں میں گوروں کی پلٹن دورہ پر نکلی تھی ہم لوگوں کو ان سے ہاکی، فٹ بال کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ مرحوم ایک بار مصر ہوئے کہ انہیں بھی ٹیم میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ اسکول ٹیم کے ساتھ یہ بھی پولیس کے میدان میں ہاکی کھیلنے پہنچے۔ کہنے لگے دیکھو جی ہم لوگ یہاں سے جی چاہے گا کھیلیں گے اور جیسا جی چاہے گا کھیلیں گے۔ بیچ میں ٹوکنا مت۔ میں نے کہا روئی کی مرزئی تو اتار دیجئے۔ کہنے لگے سردی لگتی ہے جب ذرا طبیعت میں گرمی آئے گی تو اتار دونگا۔ مرحوم کی پشت کا بالائی حصہ شانوں سے متصل نسبتاً زیادہ پُر گوشت تھا جس کے سبب سے ان کی گردن پیچھے سے دیکھئے تو چھپی معلوم ہوتی تھی اس پر روئی کی یہ مرزئی ہاف بیک کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ اسٹک کندھے پر رکھے ہوئے۔ کھیل شروع ہوا نصیر صاحب کے پاس گیند آئی تو یہ اسے لے کر ایک خاص انداز سے بھاگے۔ حاضرین نے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے سامنے سے ایک گورے نے آکر چاہا کہ گیند چھین لے نصیر صاحب نے گیند روک لی اور معاً گورے کے سر پر اسٹک تان کر کچھ اس قسم کی آمادگی ظاہر کی گویا اس کا سر بیچ سے دولخت کر دیں گے۔ گورا غریب کچھ ایسا جھوجکا ہوا کہ اضطراراً دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن حریف نے موقع کی نزاکت فوراً محسوس

کی اور اس طور پر بڑھا کہ نصیر صاحب کو خبر نہیں۔ ادھر یہ بھی غافل نہ تھے۔ فوراً بڑھ کر شیک ہینڈ (مصافحہ) کیا۔

تمام مجمع اور خود گورے ہنستے ہنستے لوٹ گئے!

مرحوم کو پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اور نہ امتحان میں فیل پاس ہونے کو کچھ بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے، شوخی، شرارت اور اسی نوع کی معرکہ آرائیوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ کالج میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ یا معرکہ تصنیف کرتے رہتے۔ لیکن اس طرح کے معرکے کبھی منتظمین کالج یا اساتذہ کے خلاف نہ ہوتے نہ اس کا تعلق سیاسی یا جماعتی مناقشوں سے ہوتا۔ ان باتوں سے وہ بالکل ہی بے تعلق تھے۔ ان کی ریشہ دوانیاں یا تگ و دو تمام تر اپنوں ہی تک محدود رہتی۔ مجھے یاد آتا ہے ایک بات پر آج کل جہاں طلبا قواعد پریڈ کرتے ہیں وہیں رات کے دو بجے دو جماعتوں میں جن میں کم و بیش سو آدمی تھے لاٹھی چلی، خوب خوب چوٹیں آئیں، مرحوم نے مارا بھی اور چوٹ بھی کھائی، میں نے نہ مارا نہ چوٹ کھائی، بھاگے دونوں، دوسرے دن بحث اس پر ہوئی کہ پرنسپل کے ہاں فریاد لے جائیں اور حریف کو سزا دلوائیں نصیر صاحب نے کہا ہرگز نہیں خوب پیٹا اور اچھی طرح پٹ لیے، پھر شکایت کیا اور سزا کیسی! چلو سب لوگ ہسپتال چلیں!

فریقین نے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا اور اسی صبح کو ہر کلاس میں مضروب پٹیاں باندھے لکچر سن رہے تھے جو اس قابل نہ تھے وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ اتنا بڑا ہنگامہ آٹھ دس گھنٹے کے اندر ہی اندر آیا گیا ہوا۔

کالج میں مرحوم ہمیشہ کسی نہ کسی دُھن میں رہتے۔ کبھی الیکشن کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ کبھی خطابات تصنیف کر رہے ہیں یا خاص خاص قسم کی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ کبھی کسی کمرہ میں پڑے گنگنا رہے ہیں اور کبھی برآمدہ میں کھڑے آنے جانے والوں کو گالی دے رہے ہیں اور سب کو ہنسا رہے ہیں۔ ان کے بغیر دوستوں کی محفل پھیکی رہتی تھی۔ وہ کبھی اپنے کمرہ پر نہیں پائے گئے۔ ہمیشہ کسی دوسرے کے ہاں ملے اور کسی نہ کسی نئے مشغلہ میں مصروف، دوست دشمن دونوں میں مقبول تھے۔ اس لیے کہ وہ منافق بالکل نہ تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ نصیر جتنی گالیاں دیتا ہے اتنا ہی سینہ سپر بھی رہتا ہے۔

کالج میں الیکشن کا زمانہ تھا۔ مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کے ہاتھ میں الیکشن کی باگ تھی۔ باہم سمجھوتہ کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسے مرحوم نہ ماننا چاہتے تھے اور نہ منظور کرنے کی ذمہ داری لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ دہلی چلے گئے۔ خورجہ کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ سامنے سے فریق ثانی کے وکیل آتے دکھائی دیئے۔ جنھوں نے مرحوم کو دیکھ کر جلد جلد قدم بڑھانے شروع کئے۔ نصیر صاحب بہت سٹ پٹائے کیونکہ ملاقات ہو جانے پر ان کا سارا نقشۂ جنگ درہم برہم ہو جاتا۔ ادھر اُدھر دیکھا راہ فرار مسدود نظر آئی آخر ایک غریب کتے کا سہارا پکڑا۔ یہ بے چارہ قریب ہی چپکے چپکے انتہائی ادب کے ساتھ دہی بڑے کے گرے پڑے پتے چاٹنے پر آمادہ ہو رہا تھا۔ اس کی شکل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مہینوں سے اُسے دہی بڑے کے پتے سونگھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ مرحوم نے اُسے بڑی زور سے

ڈانٹا اور اس کی طرف اس طور سے لپکے کہ اُسے مار ہی ڈالیں گے۔ کتا غریب بھاگا اور یہ اس کے پیچھے ڈھیلا پھینکتے شور مچاتے بھاگے! اس کا خیال البتہ رکھا کہ بے خیالی میں کہیں کتے سے آگے نہ نکل جائیں۔ جب تک گاڑی سیٹی دے کر متحرک نہیں ہو گئی۔ یہ برابر اس کا تعاقب کرتے رہے۔ یہاں تک کہ گاڑی چل نکلی اور یہ لپک کر پاس والے ڈبے میں بیٹھ گئے۔

۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ ذاکر صاحب، میں اور نصیر صاحب قانون کے طالب علم تھے، قیام صاحب باغ کی دوسری منزل پر تھا۔ چھت پر صرف ایک غسل خانہ اور ایک بیت الخلا۔ وہ بھی انگریزی وضع کا۔ آبادی کافی تھی، مختلف ڈیل ڈول اور مختلف عادات و اطوار کے، پشاور، آسام، مدراس، سندھ۔ یو۔پی اور پنجاب کے خاص الخاص نمائندے جمع ہو گئے تھے غسلخانہ اور بیت الخلا سے متعلق نت نئے پیچیدہ اور دلچسپ مسائل پیدا ہوتے رہتے۔ ذاکر صاحب اسسٹنٹ ٹیوٹر تھے لیکن انھوں نے اس طرح کے مسائل کا تصفیہ نصیر صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں سلجھائیں کسی کو انحراف کرنے کا حق حاصل نہ ہو گا۔ ہر شخص نے اس سے اتفاق کیا۔ نصیر صاحب حسب معمول بڑے شوق اور تن دہی سے اس فریضہ کو پورا کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے ہر شخص کے بیانات سنے۔ خوب خوب بحثیں کیں۔ یوں تو شاخ در شاخ بہت ساری باتیں پیدا ہوئیں جن کا تذکرہ نامناسب ہے، نہ ممکن، صرف دو ایک کے بیان کر دینے میں مضائقہ نہیں۔

ایک صاحب کسی ریاست کے باشندے تھے۔ پکی تول سے تقریباً تین من کے اسی حساب سے غذا اور اسی حساب سے نتائج ناشدنی و ناگفتنی۔
ایک اور صاحب سرحد سے بھی پرے کے رہنے والے تھے، "سوکھے یعنی خشک چھوہارے" کے نام سے مشہور تھے۔ اوّل الذکر کے بارہ میں بہاب کو یہ شکایت تھی کہ یہ بیت الخلا میں اپنا وقت تو بہت کم صرف کرتے تھے لیکن خود بیت الخلا کو دوسروں کے لائق نہ چھوڑتے تھے۔ دوسرے صاحب کے بارے میں یہ شکایت تھی کہ یہ وقت بہت زیادہ لیتے تھے۔ لیکن پلے کچھ نہ پڑتی تھی نصیر صاحب نے فیصلہ کیا کہ ریاست والے صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ حملہ کسی کھیت میں کیا کریں۔ اس کے بعد بیت الخلا پر خشک چھوہارے کو سمجھایا کہ ان کے لیے دین و دنیا دونوں میں طہارت معاف ہے۔ وہ اپنی چارپائی پر ہی فراغت کر سکتے ہیں۔ نوکر بستر جھاڑو کیا کرے گا۔ ضمناً نصیر صاحب نے یہ ہدایت نافذ کر دی کہ جو لوگ بیت الخلا میں زیادہ وقت صرف کرنے کے عادی ہیں وہ ابتدائی مراحل اسسٹنٹ ٹیوٹر صاحب کی نگرانی میں اُن کے کمرہ کے سامنے طے کر لیا کریں اور جب ان کو اپنے آپ پر پورا اعتماد ہو جائے تو بیت الخلا میں داخل ہوں۔
غسل خانہ کے بارے میں نصیر صاحب نے یہ ہدایت کی کہ جس پر شرعی غسل واجب ہو اس کو تفریحی غسل کرنے والے پر ترجیح دی جائے گی بشرطیکہ اوّل الذکر نصیر صاحب کو حالات و حوادث سے مطلع و مطمئن کر کے ان سے پاس حاصل کر لے۔ غسل خانہ میں گنگنانا یا شعر پڑھنا اخلاقی نقطۂ نظر سے

مذموم و ممنوع قرار دیا گیا۔ نصیر صاحب نے اس کی وضاحت بھی کر دی لیکن یہاں ان کو دہرایا نہیں جا سکتا۔

صاحب باغ کا باورچی خانہ نہایت تنگ تاریک تھا۔ ایک دن رات کے کھانے پر ایک صاحب کی پلیٹ میں چھپکلی کا ہڈی کا پورا ڈھانچہ آیا۔ ممکن ہے بے نصیب چھپکلی ٹھیک دیگچی کے اوپر چھت میں چپکی ہو اور گرمی اور دھوئیں سے بدحواس ہو کر دیگچی میں ٹپک پڑی ہو۔ صاحب باغ میں کہرام مچا نصیر صاحب بھی پہنچے۔ ڈھانچہ دیکھ کر دھک سے رہ گئے اور چہرہ سے ایسی تشویش کا اظہار کیا کہ سارے لوگ تھوڑی دیر کے لیے دم بخود ہو گئے پھر نہایت مایوسانہ انداز سے ایک ایک کا منہ تکنے لگے لوگ متحیر تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، بالآخر نہایت رقت کے لہجہ میں فرمایا، بھائیو! جو ہوا سو ہوا، صبر تو بہر حال کرنا ہے، لیکن گھر والوں پر کیا گزری ہو گی۔ مرحوم کو میں جب کبھی دیکھتا تھا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ دن دور نہیں جب یا تو وہ خود کشی کریں گے یا میں۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھ سے پہلے چل بسیں گے لوگ متحیر تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے آخر پوچھا گیا کہ یہ سب کیا اور کس کے بارے میں ہے تو مرحوم نے فرمایا آپ سب تو ہیں، شفیق اور مردود دیکھتے نہیں یہ ڈھانچہ خشک چھوہارے کا ہے!

نصیر صاحب کے اس لطیفہ پر لوگوں نے زبردست قہقہہ لگایا اور لطف یہ کہ خشک چھوہارے نے اس کی سب سے بڑھ کر داد دی۔ اور یہ محض اس وجہ سے کہ سب جانتے تھے کہ نصیر بڑا ہی جاں نثار اور مخلص دوست تھا پھر لطیفہ کی داد

دنیا خواہ کوئی زد میں آتا ہو ایم اے او کالج والوں کی سیرت کا خصوصی امتیاز تھا جو آج کل بہت کم نظر آتا ہے۔

نصیر صاحب سب جج ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ اپنی کوٹھی پر بنیائن پاجامہ پہنے بیٹھے رہتے۔ ہر طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے اور سب سے دل کھول کر ہنستے بولتے۔ ان کی بے تکلفی ان کے خلوص کا آئینہ تھی۔ وہ اس اعتبار سے عجیب و غریب آدمی تھے کہ ان پر فریقین معاملہ کو کلی اعتماد ہوتا۔ وہ عدالت میں فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے مکان پر فریقین میں مصالحت کرا دینے کی کوشش کرتے۔ ایک بار میں نے نصیر صاحب سے کہا کہ آپ جو مقدمات کا تصفیہ گھر پر کرانے کے درپے رہتے ہیں اس کا نتیجہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ کہنے لگے ہاں ہاں ایسا حاکم قانونی استعداد کے اعتبار سے نیاز مند سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ جنگ کی ہلاکتیں دیکھے اٹھائے ہوتے ہیں ان سے پوچھو جنگ کسے کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کی جنگ خواہ وہ قانونی ہو تجارتی ہو یا فوجی بڑی تباہ کن ہوتی ہے۔ مقدمہ بازی نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا تم کو اندازہ نہیں ہے اس کو میں سمجھتا ہوں اور میں ہی جانتا ہوں۔ عدالت میں قانونی انصاف ہوتا ہے حقیقی انصاف تو جج کے شریفانہ سمجھوتہ ہی میں ہوتا ہے۔

ایک دن میں نے دیکھا اپنی کوٹھی میں آرام کرسی پر دراز ہیں بنیان اور پاجامہ زیب تن ہے۔ ہر طرح کے لوگ جمع ہیں حقے اور پان کا دور چل رہا ہے اور نصیر صاحب کے فقروں سے محفل کشتِ زعفران ہے اور بنیان الٹی پہنے

ہوتے ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا تو بولے ارے ہاں تم تو جانتے ہو بنیائن کا بڑا عیب یہ ہے کہ اُتارو تو اُلٹی اُترتی ہے۔ اُتار لیجیے، سیدھا کیجیے اور رکھیے۔ کون اس دردِ سر میں مبتلا ہو۔ جوں کی توں پہن لینے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ ایک دفعہ اُلٹی رہتی ہے، دوسری بار سیدھی خود بخود اُلٹ پھیر ہوتا رہتا ہے۔

نصیر مرحوم کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ ان کو غیر موزوں اور مہمل اشعار بھی سالہا سال جوں کے توں یاد رہتے۔ اسے میں بڑا کمال سمجھتا ہوں کیونکہ میں خود ان لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک انھیں ناموزوں نہ بنالیا جائے۔ منشی ٹھاکر پرشاد شاداں ایک بڑے زوردار شاعر تھے۔ ایسے ایسے معرکے کے اشعار تصنیف کئے تھے کہ ہمارے زمانہ میں ان کے کلام سے کالج کے درودیوار گونجتے تھے۔ مرحوم ہی نے ان کو ہم سے روشناس کرایا تھا۔ شاداں اس زمانہ میں اتنے مقبول ہوئے کہ ان کو خط لکھا گیا کہ کلام کے کچھ نسخے بقیمت بھیج دیے جائیں کچھ دنوں بعد شاداں کے صاحبزادہ کا خط آیا، کلام شاداں کے کئی نسخے بھی تھے۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"۔۔۔۔ قبلہ گاہی صاحب مغفور کے کلام کی اہلِ ہندوؤں نے کوئی قدر نہ کی۔ صرف اہلِ اسلاموں نے کی۔۔۔۔"

کالج میں مدتوں اہلِ ہندوؤں اور اہلِ اسلاموں کا فقرہ مقبول رہا نصیر مرحوم ان کا کلام بڑے مزے لے لے کر سناتے تھے۔ شاداں کا کلام یوں

بھی سرتا سر مرصع تھا۔ اس پر مرحوم کی زبان میں لکنت اور آواز میں کھٹک
سناتے تو مزہ آجاتا۔ شاداںؔ کی ایک غزل تھی جس کا عنوان غالباً یہ تھا۔

"غزل یگانہ بصنعت اعراب سہ گانہ"

نمونہ ملاحظہ ہو :-

جنہیں آیا یہاں پہ وہ دل شکن نہ کہا کسی کو یہ اس نے کُن
تنہیں فارسی ہیں یہ بولے کن جنہیں باجے چھُن تیرے گھونگرو
نہیں دیکھتا ہوں کبھی شِکن نہ سُنا ہے گولی کی کچھ بھی پن!
نہ کہا ہے دیکھئے کچھ بھی پَن جنہیں باجے چھُن تیرے گھونگرو
کریں ہیں جو کھیاں یوں ہی بھُن کریں پھر یہی دیسی بھِن
گیا شاداںؔ کا بھی دل بھُن جنہیں باجے چھُن تیرے گھونگرو

شاداںؔ کی ایک غزل کے چند اور اشعار سُنیئے :-

مضمون قد یار کا ہے راست تھاڑ باندھ
بوسہ کے واسطے نہ ضرورت ہے پاڑ باندھ
گر ہے ہوس ہُما کو کسی طرح پھانسنے
ترکیب یہ ہے دام میں اس کے تو ہاڑ باندھ
فرہاد سے جو ملنے کی خواہش ہو کوہ پر
تیشے کو لے کے جائیو اور ایک کلہاڑ باندھ

ایک جگہ مضائقہ، لائقہ، دقائقہ کے سلسلہ میں خود بندھ
گئے ہیں ۔۔۔

لالہ ہوں لکھنؤ کا دکھوں لکھنؤ کا داغ
پھولوں جو غیر جا پہ، کھاؤں شقائقہ

مرحوم بڑی محبت کے آدمی تھے۔ اور اپنی وضع کے بڑے پابند، دوستوں کی بڑی مدد کرتے تھے، کنبے والوں کا سہارا تھے۔ ان کی وفات سے کتنے بے خانماں و کس مپرس ہو گئے۔ میں نے ایسا کنبہ پرور اور دوستوں پر جان چھڑکنے والا بہت کم دیکھا ہے۔ نکمّے، معذور، ہٹے کٹے غرض ہر طرح کے کنبے والے ان کے ساتھ رہتے۔ جو نہیں رہتے تھے انھیں روپے بھیجتے رہتے۔ سب کو ایک نظر سے اور عزّت و محبّت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سب کو ایک طرح کا کھلاتے پہناتے تھے، سب کو سب سے ملاتے تھے بغیر اس خیال کے کہ لوگ کیا کہیں گے اور کیا نہ کہیں گے۔ وہ غریب کم رتبہ اور بدحال عزیزوں کو اپنانے میں کسرِ شان نہیں سمجھتے تھے۔ کہنے کو یہ بہت بڑی بات ہے اور سمجھ میں نہ آئے تو ذرا خود اس طرح رہنے کا ارادہ کیجئے پھر دیکھئے کتنا جلد آپ کا نفس آپ سے کیا سلوک کرتا ہے اور آپ اپنے عزیزوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔

مرحوم شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ جہاں گئے وہاں شعر و شاعری کی محفل گرم ہو گئی۔ یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مرحوم کو جتنی ہزلیات یاد تھیں اور ہزلیات کی انھیں جیسی مشق تھی اتنی بہت کم لوگوں کے حصّہ میں آئی ہو گی۔ ہر طرح کی اور ہر درجہ کی ہزلیات —— ہزلیات کے حق میں کلمۂ خیر کہنا ممکن ہے بعض بزرگوں کے نزدیک بھلمنساہت

سے گری ہوئی بات ہو۔ کچھ شاید میری دانش مندی میں بھی شک کریں، لیکن اس فن میں درجہ کمال حاصل کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اُردو فارسی میں ہزلیات کے نام سے جو کلام ملتا ہے اُسے فحاشی یا مغلّظات کہنا زیادہ موزوں ہے جس طرح طنز یا ظرافت میں ذرا پاؤں ڈگمگائے تو نتیجہ یا مسخرا پن (یا ان دونوں کا مجموعہ سفلہ پن) ہوتا ہے۔ اسی طرح ہزل میں ذی بدکرداری یا بیہودہ گفتاری کا دخل ہو تو وہ صرف مغلّظات بن کر رہ جاتی ہے اچھے شعر کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ پڑھے جانے پر وہ سامعین کی تمام تر توجہ اس طور پر جذب کر لے کہ اگر اس میں کوئی نقص بھی ہو تو اس کی طرف فی الفور ذہن منتقل نہ ہو اسی طرح سب سے اچھی ہزل وہ ہے جس کے پڑھے جانے پر سامعین کا ذہن اس کے رکیک یا سخیف پہلو میں اُلجھ کر نہ رہ جائے بلکہ شاعر کی سلیقہ اور طبّاعی کی داد دینے پر مجبور ہو جائے ظاہر ہے ہزالی، ہزالی ہی ہے لیکن اُس شاعر کے کمال کو آپ کیا کہیں گے جو گندگی سے کھیلتا ہے۔ لیکن طہارۃ زائل نہیں کرتا نہ اپنی —— اور نہ غالباً آپ کی!

مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کو اُن کے دوست نہ جلد بھولیں گے اور نہ بھولنا گوارا کریں گے —— اور یہ بڑی بات ہے۔!

یلدرم کی یاد میں

اپنے رفقاؔ اور طلباؔ سے مجھے اکثر اس مسئلہ "پر نکلنے" کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنونِ شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیش نظر ہیں ان کی دل افروز شاعری اور انشاء پردازی تمام تر ان کی دلآویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں جو شاعر اور انشاپرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اور انشاء پردازی میں خامی بھی اسی حد تک ملتی ہے جس حد تک بحیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اونچا یا اس سے علیحدہ ہو!

یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڑھ کے اس زمانہ کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی۔ نہ اب جب زندگی سوا خوش باشی سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ؎

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گزری تھی بہت

جب سے اب تک زمانہ کے رویہ اور روانی میں بہت کچھ فرق آگیا ہے۔ کیسا کچھ فرق۔ جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں تھے "اب ان پر" رونے والا کوئی نہیں لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی اُن میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت شخصیت کا بہت اہم اور عظیم بالشان پہلو ہے۔

انھوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو بکسر زیر و زبر کر سکتی تھیں لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد و امید آفرینی تھی کہ ان کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے انتظامی اور ادبی بھی لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سر سے پاؤں تک شریف شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے اُنھوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب

نواب سر مزمّل اللہ خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جدا گانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے ساتھ کیا سازش کسی سے نہ کی۔ میرے نزدیک یہی ایک بات یلدرم کی شرافتِ نفسی اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر کو ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری وہ یونیورسٹی میں بھی رہے اور کالا پانی میں بھی لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جس کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ گرمی آئی ہے نہ روشنی اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہو سکتا ہے الاّ شعر و ادب سے۔ اس یونیورسٹی میں شعر و ادب کے دیوانے ہیں نے دو ہی پائے۔ دونوں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ ایک مولانا احسن مارہروی دوسرے سجاد حیدر یلدرم۔ ترکی۔ ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا۔ ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وارفتگی طاری ہوتی تھی میں ترکی سے واقف نہیں ہوں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاندار ہے یا اس میں آپ کی شائبہ خوبیٔ تحریر کا بھی کچھ دخل ہے؟ ایک دفعہ جھوم ہی تو گئے آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی اور چہرہ جگمگا اٹھا کہنے لگے جناب (سید صاحب جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اس پر مخصوص انداز سے زور دیتے) ترکی زبان جانتے

ہیں کس کی زبان ہے ہماری آپ کی نہیں ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا ہی
تو میں کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے آپ کی تو کبھی نہیں ہے مسکرائیے
اور بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور ان ہی کی ہو سکتی ہے یہ ان لوگوں کی
زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آرائوں کی زبان ہے اس
میں ترک تازی ہے۔ سید صاحب پر اب تک کیفیت طاری ہو چکی تھی چنانچہ
اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے نامق کمال کا مشہور ڈراما جلال الدین خوارزم شاہ
میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا جس کا
بیشتر حصہ سہیل میں شائع ہوا۔ سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ نہیں
کرتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا۔ سید صاحب ترجمہ لکھاتے جاتے وہ لکھتا
جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جا رہے ہیں
میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے ہیں لیکن جہاں تک اردو الفاظ
فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے میں سید صاحب کے اس کمال کا معترف ہوں
کہ وہ بڑے اچھوتے بڑے جاندار اور بڑے گوارا اردو الفاظ استعمال کرتے
تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کی اختراع کا ترجمہ میں بڑا دخل ہوتا ہے،
اور یہ بات صرف کسی غیر معمولی مترجم کے حصہ میں آتی ہے یہاں مجھے مولوی
عنایت اللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں جن سا باکمال ترجمہ کرنے والا اردو
ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کو
سمجھنے کی استعداد عنایت اللہ مرحوم میں خرق عادت کی حد تک پہنچ گئی تھی
یہ بات ان ہی کے حصہ میں آ سکتی تھی۔ وہ اردو کے گہوارہ میں نہیں پلے

تھے بلکہ اُردو ان کے گہوارہ میں پلی تھی۔ وہ اہلِ زبان ہی نہ تھے متمدّن بھی تھے!

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کئے ہیں اُردو مضامین نسبتاً کم ہیں ترکی انشاپردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اُردو لکھنے میں ان کا قلم ترکی تال وسم قبول کر لیتا تھا۔ سیّد صاحب کے اس رنگ و آہنگ پر بعض لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوتی ہیں بذاتِ خود میں اُردو میں اس اندازِ ترکانہ کو بڑا اچھا اضافہ سمجھتا ہوں۔

سیّد کے اسالیب انشا اور ان کی مصنوعات سیّد کی شخصیت کی بڑی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُردو میں انشائے لطیف کا رشتہ کھینچ تان کر ملا وجہی کی سب رس سے بھی ملایا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک سب رس کا انداز متغزلانہ تصوّف کا ہے جو انشائے لطیف سے جوڑ نہیں کھاتا۔ انشائے لطیف نے آگے چل کر ٹیگوریت کا رنگ اختیار کر لیا اور ٹیگوریت نے اُردو میں سستے اور اونیٰ درجہ کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقاتِ ادب کو سختی سے احتساب کرنا پڑا اور یہ انداز جلد ہی نظروں سے گر گیا۔ یہاں تک کہ جو اصحاب اس کے سب سے بڑے حامی تھے۔ وہ سب سے پہلے تائب ہوئے۔ اُردو میں ٹیگوریت کی جس طرح ابتدا ہوئی اور جیسا اس کا انجام ہوا مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے شعر و ادب کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔ جس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

شررؔ اور ریاضؔ کے عاشقانہ مضامین اور یلدرمؔ کی انشائے لطیف میں فرق ہے۔ شررؔ کا اسلوب انشا اور ان کا عشق دونوں کتابی ہیں، بندھے ٹکے

ڈھلے ڈھلائے شخصی تاثرات کی ترجمانی نہیں شاعرانہ زبان و بیان کی نمائش ملتی ہے۔ ریاض میں زبان و بیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے۔ ریاض کی شاعری میں جو پر تفنن لیکن سطحی شوخی ملتی ہے وہ اُن کی نثر میں پہنچکر سستی اور عامیانہ بن گئی ہے۔ شاعری میں جو اندازِ بیان شاعری کا حسن ہے وہ نثر میں پہنچکر مصنوعی اور مہمل ہو جاتا ہے موضوع اور مطمح کے یکساں ہونے کے باوجود نثر اور نظم کی مقتضیات میں فرق ہے۔ ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔

یلدرم کے ہاں بھی حسن و محبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجاز کی مردگی و تازگی ہے شرر اور ریاض کی پیدا دار بکیسر مثبتی ہے، سجاد کی دستی، سجاد انصاری کو بھی انشائے لطیف کا پیرو قرار دیا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سجاد انصاری کے یہاں نفسیاتی تحلیل ملتی ہے جس کو انشائے لطیف سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں انشائے لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے بقولے ؎

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے

لیکن جس طرح غزلوں میں آرٹ اور انداز کے اختلافات ملتے ہیں ادبِ لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں۔ یلدرم اور ادبِ لطیف کے بعض دوسرے علمبرداروں میں یہ فرق واضح ہے۔ سجاد حیدر کے ہاں شوخی بھی ہے، شرارت بھی لیکن شہدپن نام کو نہیں۔ یلدرم کے ہاں عورت کا بڑا عمل دخل ہے، لیکن اُن کے ہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے۔ اعصاب کا تشنج نہیں۔ مہدی افادی

کے ہاں خیالات کی رعنائی اتنی نہیں ہے جتنی جذبات کی رنگینی۔ مہدی کے اعصاب پر اگر عورت سوار نہیں ہے تو کچھ بیدل بھی نہیں ہے۔ افادی کہیں کہیں تو شوق کی مثنویوں سے جا ملتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی تحریروں میں جہاں تک عورت کا تعلق ہے مراتبِ جنسی کا اتنا ہی فرق ہے جتنا تفاوتِ زمانی کی بنا پر ہونا چاہیئے۔ اگر ان دونوں کو ایک دوسرے کے عہد میں منتقل کر دینا ممکن ہوتا تو مہدی، شوق بن جاتے اور شوق، مہدی۔

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات نہایت واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رو اور روانی میں بھی اپنے ذہن اور وقار کو بہہ نہیں جانے دیتے۔ سجاد صاحب کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند نہ تھے جس کے ہاں خیالات کی رعنائی ہو اس کے ہاں جذبات کا ہیجان و طغیان یوں بھی کم ہوتا ہے پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آگئے ہیں سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبشِ قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے اور اس طور پر معتدل کیا ہے کہ اظہارِ مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی داغدار نہ ہوا۔

میرے نزدیک انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت و عفت کو جس طرح یلدرم نے متوازن رکھا ہے کسی اور نے نہیں رکھا ہے۔ سجاد حیدر کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے قاضی عبدالغفار اس بارے میں یلدرم سے ملتے جلتے ہیں لیکن دونوں کی ذہنی پرداخت میں تفاوت ہے۔ غفار کی تحریر میں طنز کی تیزی و تلخی بھی شامل رہتی ہے۔ اس طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عبدالغفار، سجاد حیدر کی بجائے سجاد انصاری

سے زیادہ قریب ہے۔ مجھے اکثر یہ محسوس کرکے خوشی اور اطمینان ہوا ہے کہ انشائے لطیف کے تین بڑے اچھے اور مکمل نمونے ہمارے یہ تین چوٹی کے انشا پرداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر۔ سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے وہ اس زمانہ میں بھی جوان تھے جب جسم و جان کے اعتبار سے نحیف و نزار ہو چکے تھے تعلیم نسواں، اُردو ٹائپ، اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل کی اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پرور واقع ہوئے تھے۔ اُردو ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی شاعری کے بڑے مداح تھے اور ان کی ایک مخصوص نظم بڑے مزے سے لیکر پڑھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک فارسی مجلّہ ـــــ کاوہ برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آرہے تھے۔ ہمراہ بہت سارے لفافے۔ کاغذات کے کچھ منتشر اجزا ایک آدھ اخبار اور رسالے بغل میں دبائے ایک رسالہ پڑھتے جا رہے تھے۔ بس اُن سے کوئی بیس یا پچیس قدم پیچھے آرہا تھا اس کی خبر سجاد صاحب کو نہ تھی۔ سید صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے، رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی۔ ہموار۔ کسی قدر تیز چھوٹے چھوٹے قدم لیتے تھے۔ نگاہ نیچی تقریباً عمودی۔ دس بارہ قدم چل کر ایک ذرا کی ذرا رُک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔ اس پر اُن کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چُست کیا تھا

کہ سجّاد تم چلنے میں سانپ کو شرمانے ہو وہ بھی چلتے چلتے رُک جاتا ہے سر اُٹھا کر
اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے۔ اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے
کہنے لگے سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی اس کی تعریف نہ کروگے
اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آ رہا۔
سجّاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی میں نے اُٹھا لیا۔ کچھ ہی دور اور بڑھے تھے
کہ دوسرا لفافہ گرا۔ وہ بھی میں نے اُٹھا لیا۔ باب العلم کے قریب پہنچے کہ تیسرا لفافہ
نے مفارقت کی۔ وہ بھی میں نے قبضہ میں کیا۔ سجّاد صاحب برابر رسالہ کے
مطالعہ میں منہمک رہے۔ سیّد صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی پہنچا آفس پہنچکر
موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کئے۔ معلوم ہوا تین لفافے
گُم ہیں۔ چونک پڑے اور تھوڑی دیر تک سخت متفکر رہے ہیں۔ میں نے تینوں
لفافے کچھ کچھ وقفہ سے واپس کئے۔ سیّد صاحب فرمانے لگے کہ آپ بھی کمال
کرتے ہیں فوراً کیوں نہ دے دیئے۔ اس وقت مجھ پر کیا گزر گئی۔ میں نے کہا آپ
مطالعہ میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا میرا یہ کہنا تھا کہ سب
کچھ بھول گئے۔ فرمایا خوب یاد دلایا یہ ملاحظہ فرمائیے "ایرانشہر" ہے ٹائپ
میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جاندار مضامین و نظمیں ہیں ایرانی
وطن پرستوں نے برلن سے اسے شائع کیا ہے۔ کاش اُردو میں ایسا پاکیزہ
اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے۔ اور جناب بات تو یہ ہے جب تک
"بتِ سنگی" لیتھو کی چھپائی سے رشتہ نہ توڑینگے۔ اُردو کی اشاعت مسدود
رہے گی۔ میں نے کہا۔ سیّد صاحب "بت سنگی" کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک

درجہ بھی ہے۔ بتِ آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقولِ شخصے ۔ ؎

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا یہی تو ستم ہے، آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں بھُس ملا دیتے ہیں۔ اکبرؔ نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کر دی۔ میں نے عرض کیا سید صاحب اکبرؔ نے کہیں بھُس نہیں ملائی صرف بھُس میں چنگاری لگائی ہے۔ ہنسے پھر فرمایا اور جناب بھی تو کچھ دُور نہیں کھڑے ہیں!

سید صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ یلدرمؔ کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے۔ اُن کی سب سے پہلی نظم مرزا اچھویا بتائی جاتی ہے۔ اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن گذشتہ علی گڑھ کی زندگی کے بعض دلکش پہلو لطف سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جا سکتا ہے، سید صاحب کی نقاشی نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے۔ ان کا مزاج رومانی تھا وہ رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ پستی کی طرف ہرگز نہیں، موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کر دی گئی ہے اس کو مزاج و خیال کی رنگینی کی بجائے مطالباتِ جنسی قرار دیا گیا ہے۔ وہ بھی اس طور پر کہ جو چیز صحت کی دلیل تھی وہ مستقل (اور لاعلاج) مرض قرار پائی۔

سجادؔ صاحب کی ایک نظم جو اُن کی رنگینی، رسائی طبع، بصیرت کی پاکیزگی اور اُن کے نقطۂ نظر کی دلآویزی کی ترجمان ہے۔ شملہ کالکا لائن پر ایک نظارہ کے عنوان سے سب سے پہلے سہیل میں شائع ہوئی۔

سید صاحب کی یاد کے ساتھ یہ نظم ہمیشہ وابستہ رہے گی ؎

ماتھے پہ بندی۔ آنکھ میں جادو ہونٹھوں کی بجلی۔ گرتی تھی ہر سو
چال لچکتی۔ بات لہکتی! جیسے کسی نے۔ پی ہو دارو
انگھڑیاں ایسی جن میں تھے رقصاں لمحہ میں رادھا۔ لمحہ میں راہو
ایسی پھڑک تھی خلق تھی حیراں ریل پر آیا۔ کہاں سے آہو

سجاد صاحب کو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا ان میں سے کسی کا نام آجاتا تو سید صاحب وجد میں آجاتے۔ جس زمانہ میں وہ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے ایک بار ان کو ترکی جانے کا موقع مل گیا! میں کیا بتاؤں اُن پر کیا نشاط طاری تھا۔ صحت اچھی نہ تھی میں نے کہا سید صاحب سفر طویل ہے۔ تکلیف وہ بھی کیسی گزرے گی؟ فرمایا ترکی کے خیال میں طبیعت مگن ہے مگر شگون اچھا ہے اور ہر اعتبار سے اچھا۔ یا یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائے گی یا پھر دیکھئے گا کیسا رقصاں و شادماں واپس آتا ہوں۔ چند ماہ بعد واپس آئے۔ سید صاحب یوں بھی سُبک رفتار تھے۔ واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں جسم میں توانائی چہرہ پر بشاشت اور سُرخی آگئی تھی۔ میں نے پوچھا ترکی میں کوئی تبدیلی پائی؟ فرمایا شروع سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی نظر آئی لیکن مجھے تو ترکی سے اُلفت ہے اس کے بدلنے نہ بدلنے سے کیا سروکار۔

ترکی ادیبہ خالدہ خانم اور اُن کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے موصوفہ علی گڑھ تشریف لائیں تو یونین میں سجاد صاحب نے اُن کا خیر مقدم کیا اور ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشا پردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔

خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب وہ اپنے اگلے اسلوبِ انشا سے تائب ہو گئی ہیں اور اُسے صرف ایامِ جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہو گئے۔ بعد میں ایک صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ خانم کو کیا معلوم اُن کی ایامِ جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے۔ پھر خلطِ بحث سے کیا حاصل۔ سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں!

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے ان کو جوڑ توڑ بالکل نہ آتا تھا وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سُنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہلِ مناصب سے بھی مرعوب نہ ہوئے۔ لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ سیّد کو میں نے شاید ہی کبھی "تم" کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سُنا ہے۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا۔ اور ہنسی دل لگی میں ان کے مُنہ سے کبھی ایسے الفاظ نہ سُنے جو مذاقِ سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلف کے یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ اُن کی بے تکلفی میں دوستانہ

اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی ۔ وہ اسی حد تک تکلّف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلّف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسنِ معاشرت کا جزوِ اعظم سمجھی جاتی ہے۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جو اونچی سے اونچی اور بڑی سے بڑی مجلسوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے ۔ شعر و ادب کا ان کا ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے ۔ وہ اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے جو بات اُن کے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے ۔ اُن کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا ۔ شعر و شرافت کے جو لوگ حامل یا قدرداں تھے ۔ وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں ہوں بلدرم سے واقف اور اُن کی خوبیوں کے معترف تھے ۔

سیّد سجّاد حیدر اُن لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سوادی ہونے کی دلیل ہے ۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ یک رنگی اور توازن ہو ۔

وہ ہم سے جُدا ہو گئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے اُن سے کبھی جُدا نہ ہوں گے ۔ مجھے یقین ہے فردوس میں اُن کو وہ رنگینیاں اور رعنائیاں بھرپور نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں ؛

سر شاہ محمد سلیمان

بہت دنوں کی بات ہے، جب چھوٹے چھوٹے شہروں یا بستیوں میں معمولی واقعہ پر غیر معمولی دھوم دھام یا ہلچل مچ جاتی تھی، چونتیس پینتیس سال گزرے ایک صبح جونپور کے چھوٹے سے شہر میں غیر معمولی ہماہمی کے آثار پیدا ہو گئے میں اسکول کے ابتدائی درجوں میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں جو شہر کے عین وسط میں ہے رہتا تھا۔ سامنے لوہے کی مضبوط سلاخوں کا جنگلا بورڈنگ ہاؤس اور شاہراہ کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک جلوس گزرنے لگا۔ بورڈنگ کے سارے لڑکے جنگلے پر آ گئے۔ جالی کے پیچھے سے کسی منظر کے دیکھنے کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جس کو چھوٹے بچے اور اچھے شاعر ہی سمجھ

سکتے ہیں۔

پھولوں سے لدی اور سجی ہوئی دو گھوڑوں کی ایک پُرتکلف گاڑی گزر رہی تھی۔ جس میں دو ایک بزرگوں عزیزوں کے ساتھ ایک معمولی جسامت لیکن نہایت درجہ نمایاں ذکاوت کا ایک خوش رو لڑکا بیٹھا ہوا تھا جس کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ کبھی جھک کر دائیں بائیں دیکھتا۔ کبھی ہار پھولوں سے اُلجھ جاتا۔ کبھی پاس والوں سے جلد جلد باتیں کرنے لگتا۔ کبھی گاڑی کے تکیہ سے پیٹھ لگا لیتا۔ لیکن فوراً ہی آگے جھک کر کچھ دیکھنے لگتا۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے اُٹھ کر جلوس کو چیرتا پھاڑتا کودتا پھاندتا سب سے آگے نکل جائیگا۔ دو رویہ لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر چھوٹا بڑا جوان بوڑھا یہ سمجھتا تھا کہ یہ خوشی اُسی کے گھر اُتری ہے۔ اور خوشی منانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ جونپور کے مشہور گھرانے اور سب سے مشہور وکیل حافظ محمد عثمان صاحب کے بڑے لڑکے شاہ محمد سلیمان تھے۔

نئی دلّی سے نظام الدین اولیاؔ کی طرف ایک خاموش جلوس جا رہا تھا۔ ہر طرح کے لوگ ملول و محزون کشاں کشاں چلے جا رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے نظام الدین اولیاؔ پہنچا۔ ایک تازہ قبر نظر آئی۔ آس پاس کی زمین روندی ہوئی تھی جس پر پانی چھڑکا گیا تھا۔ قبر پر ہار پھول کا انبار تھا۔ یہاں الہ آباد ہائیکورٹ اور فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ریاضیات کے مشہور ماہر اُردو شعر و ادب کے شیدائی اور ماہر مانے ہوئے شریف النفس انسان سر شاہ محمد سلیمان نظام الدین اولیاؔ کی سنسان پُراسرار بستی میں بقدر ایک سکوت اضافہ کر کے

آسودۂ خاک تھے!

قانون میں جو اُونچا درجہ سر شاہ کو حاصل تھا اس سے ہم میں شاید ہی کوئی ناواقف ہو اور شاید ہی کوئی ایسا ہو جو قانون سے مجھ سے زیادہ ناواقف ہو۔ اس لیے میں ان کی قانونی فتوحات پر کوئی تبصرہ نہ کرونگا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ جو لوگ قانون سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے خواہ وہ کوئی ہوں اور کیسے ہی ہوں سر شاہ سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کے بعض ایسے قانونی معرکوں کا مجھے علم ہے جہاں سر شاہ کی قانونی نکتہ سنجی ہی کا نہیں۔ بلکہ اس سے بدرجہا سخت آزمائشوں کا امتحان رہا۔ لیکن سر شاہ نے قانونی مطالبات سے سر مو انحراف نہ کیا۔ شخصی اعتبار سے سر شاہ نرم خو واقع ہوئے تھے۔ ہر شخص کی سن لیتے تھے ہر شخص کو راضی رکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے عواقب بھی بھگتتے تھے۔ لیکن جب قانون کا پاؤں درمیان ہو تو پھر وہ سب کچھ بھول جاتے تھے اور وہی کرتے تھے جو قانون کا مطالبہ ہوتا۔

شروع سے آخر تک وہ قانون میں ایسے رچے بسے تھے کہ قانون اُن کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔ اس بارے میں ان کی مثال ایسے شخص سے دی جا سکتی ہے جس کے شعور میں یہ حقیقت پیوست ہو گئی کہ خدا حاضر و ناظر ہے۔ اس لیے اس کو خلوت و جلوت میں کہیں بھی خدا کے بتائے ہوئے رستہ سے انحراف نہ کرنا چاہیئے خدا کا نہیں قانون کا یہ تسلط عملی زندگی میں بعض عجیب اُلجھنے پیدا کر دیتا ہے سر شاہ قانون سے خوب نپٹے تھے۔ شیطانوں سے بالکل نہیں نپٹ سکتے تھے۔

سر شاہ کو طبیعاتی ریاضی سے بڑا شغف تھا اور اس فن میں اُن کا درجہ مانا ہوا

تھا۔ مجھے ریاضی سے طبعاً نفرت ہے۔ سرشاہ اپنی تحقیقات کے نتائج مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ طبعیات کے عام جلسہ میں اکثر پیش کرتے۔ میں محض یہ دیکھنے کے لیے کہ سرشاہ طبعیات کے دقیق مسائل پر کیسی بحث کرتے ہیں۔ تماشائی کی حیثیت سے ضرور جاتا اللہ اکبر سرشاہ کس اعتماد و دِراکی سے اس پر لیکچر دیتے اور بحث کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے تمام عمر اس شخص نے اسی فن کا کام کیا ہے۔ فن کے خواص بھی کافی تعداد میں موجود ہوتے لیکن ایک روایتی اسپیکر کی حیثیت سے اور مجھ ایسے لوگوں کی ایسے مجمع میں کمی نہیں ہوتی۔ میری رائے یہی ہوتی کہ سرسلیمان ہی کا پلّہ اونچا رہا۔ ایک چیز مجھے یاد ہے ایک مشہور پروفیسر نے بہت کچھ ردّ و قدح کے بعد کہا کہ اچھا یہ تو بتائیے آپ کا یہ نظریہ کس فارمولا کے تحت میں آتا ہے اور آپ کیونکر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں سرشاہ کا جواب یہ تھا کہ میں آپ کے سامنے نتائج پیش کرتا ہوں جو واقعات سے ثابت ہیں آپ واقعات و نتائج کی تاویل کیونکر کریں گے فارمولا تو بعد میں بنے گا۔ اور یہ میں نہ بتا سکوں تو آپ بتائیے۔

سرشاہ نے اپنی بڑی صاحبزادی کی شادی کی مرحوم کی سرگرمی و سرخوشی کا یہ عالم دیکھنے کا تھا۔ تقریب سے متعلق ساری جزئیات طے کر کے وہ دم لیتے تھے۔ ہر کام میں خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹا ہو خواہ بڑے سے بڑا ان کا ہاتھ ضرور ہوتا تھا سب سے پہلے انھوں نے مہمانوں کی تعداد متعین کی اتنے ہی دعوت نامے جاری کیے۔ پھر خود بیٹھ بیٹھ کر یہ اندازہ لگایا کہ فی کس کتنی جگہ گھیرے گی۔ فیتہ لے کر ہر چیز کو ناپ ڈالا اس طرح پنڈال کا رقبہ متعین کیا۔ پھر برف کا حساب لگایا کتنی مقدار درکار ہوگی۔ پہلے برف کی ایک معینہ مقدار منگالی اور ضروری حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے بعد گھڑی لے کر اسے دیکھا کتنی دیر میں کتنی برف پگھل جائے گی۔ اس کے بعد یہ طے کیا

کہ برف کی مجموعی مقدار کیا ہو۔

اس شادی کے سلسلہ میں سر شاہ کے باضابطہ ہونے کا ایک واقعہ نہ بھولوں گا مرحوم کسی ضروری سفر پر الہ آباد سے باہر جا رہے تھے۔ اسٹیشن پہنچے تو دیکھا کہ مزدوروں کا ہجوم ہے اور ایک تعلیم یافتہ نوجوان مزدوروں کے لیڈر کی حیثیت سے سر شاہ کے منتظر ہیں۔ نوجوان نے سرمایہ اور مزدور کے مسئلہ پر ایک دھواں دھار تقریر کی اور سر شاہ پر یہ الزام لگایا کہ لڑکی کی شادی میں انھوں نے مزدوروں کی مزدوری نہیں دی۔ اور یہ آئینِ مروّت اور آئینِ انسانیت دونوں کے خلاف تھا۔

سر شاہ نے یہ تقریر بڑی توجہ اور سنجیدگی سے سنی۔ اس دوران میں پلیٹ فارم پر اور زیادہ مجمع ہو گیا۔ مرحوم نے اپنے کلرک کو موٹر پر کوٹھی بھیجا اور بتایا کہ فلاں الماری میں فلاں فائل فلاں نمبر پر رکھی ہوئی ہے فوراً جا کر لاؤ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے مزدوروں سے پوچھتے رہے کہ تمھاری یومیہ مزدوری کیا ہے اور اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ کلرک نے تھوڑی دیر میں فائل لا کر دے دی۔ مرحوم نے فائل کھول کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کس کس شخص نے کس کس دن شادی میں کام کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی نے کام نہیں کیا تھا۔ اور سارے کے سارے مزدور ادھر ادھر سے اکٹھا کر لیے گئے تھے۔ سر شاہ نے نوجوان اور مزدور دونوں کو اپنی فائل دکھائی جس میں ہر مزدور کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ ہر ایک کے نام کے آگے مزدوری اور بیباقی لکھی ہوئی تھی اور دستخط ورنہ انگوٹھے کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد سر شاہ نہایت خوشدلی کے ساتھ جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہ تھا سب سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

نوجوان نے البتہ پھر کبھی سر شاہ کا سامنا نہ کیا۔

سر شاہ کے ایک پیشکار تھے۔ جو مرحوم کے روپے پیسوں کا بھی حساب رکھتے تھے ایک دفعہ کچھ ایسا ہوا کہ پیشکار صاحب نے بیس روپے غلطی سے کہیں زائد دے دیے۔ سر شاہ نے وہ روپے ان سے وصول کر لیے اور بولے یہ اس لیے کہ آپ سے پھر کبھی ایسی چوک نہ ہو گی۔ اتفاقاً ایک بار خود سر شاہ دو سو روپے پیشکار صاحب کو غلطی سے دے گئے حساب ہوا تو غلطی دریافت ہوئی، پیشکار صاحب نے بہتیرا چاہا کہ وہ دو سو روپے جو اُن کے پاس محفوظ تھے واپس کر دیں۔ سر شاہ نہ مانے اور فرمایا یہ دو سو روپے تمہارے ہیں یہ اس لیے کہ آئندہ مجھ سے غلطی نہ ہو۔

جس زمانہ میں سر شاہ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے ایک صاحب کی معیت میں مجھے مرحوم کی کوٹھی پر رات بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ رات کا کھانا سر شاہ کا باہر تھا ہم سب کھا پی کر سو چکے تھے۔ سر شاہ بارہ بجے رات کے بعد واپس آئے۔ میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا۔ کچھ آہٹ ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سر شاہ پورے ڈنر سوٹ میں ملبوس ایک سینی میں کھانا لیے ہوئے شاگرد پیشہ کے کوارٹرس کی طرف جا رہے ہیں۔ صبح سویرے مجھے اس کی تلاش ہوئی کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ جو نوکر تھا اُس کو کھانا نہ ملا تھا۔ سر شاہ نے ڈنر سے واپس آنے پر دریافت کیا کہ مہمانوں کی مدارات میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی اُس وقت معلوم ہوا کہ مہمانوں کا نوکر چونکہ شہر چلا گیا تھا اس لیے اُس کو کھانا نہ مل سکا چنانچہ بغیر کسی تامّل کے سر شاہ نے یہ فریضہ پورا کیا۔ گھر میں کسی نے کہا کہ نوکروں میں سے کسی کو جگا کر کھانا بھیجوا دیا جائے تو نہ مانے اور کہا کہ نوکر دن بھر کے تھکے سو رہے ہیں یہ کام مجھی کو کرنا چاہیئے۔ میں مہمان ہی کا میزبان نہیں ہوں

اُن کے نوکروں کا بھی میزبان ہوں۔

سر شاہ کو شاعری سے دلچسپی تھی۔ شاعروں کی بڑی تعظیم کرتے تھے مشاعرے میں بڑے شوق سے شرکت کرتے تھے! اور باوجود اس کے کہ وہ عام گفتگو میں لطفِ سخن کی خاطر بھی جوش اور مبالغہ کو دخل نہ دیتے تھے مشاعرہ میں اوسط درجہ کے شعر کی بھی دل کھول کر داد دیتے تھے مجھے تعجب ہوتا ہے کہ سر شاہ جیسی طبیعت اور مصروفیتوں کا آدمی اس طرح کی باتوں میں کس طرح وقت گزارنا پسند کرتا تھا مشاعروں میں اُن کی شرکت رسمی نہ ہوتی۔ اگر وہ مشاعرہ کے صدر بنا دیئے جاتے تو پھر جب تک صحبت ختم نہ ہو جاتی کوئی نہ کوئی عذر کر کے اٹھ جانا درکنار وہ شروع سے آخر تک دلچسپی لینے میں معمولی سے معمولی آدمی سے بھی پیچھے نہ رہتے۔ جہاں تک اُردو شاعری اور مشاعرہ کا تعلق ہے الہ آباد میں سر شاہ اور سر تیج سے زیادہ ان چیزوں کا اور کوئی قدر دان نہ تھا۔ سر شاہ کو ذوقؔ کے کلام سے بڑی الفت تھی اُن کے قصائد کو مدون کیا۔ اور اس پر تبصرہ بھی کیا ہے اور ایک اچھے جج کی مانند کلام کو اسی حد تک سراہا ہے جس حد تک وہ کلام سراہے جانے کا مستحق ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر ایک دور بڑا سخت گزرا جب اس پر ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا گیا تھا کمیشن نے یونیورسٹی کی آئندہ دروبست کے لیے جو سفارشات تجویز کی تھیں ان کو ایک مکمل ضابطہ کی شکل دے کر نافذ کرنا بڑا نازک اور مشکل کام تھا۔ اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جو قانونی نکتوں سے واقف ہو۔ علی گڑھ کی دیرینہ روایات کا قدردان ہو اور علی گڑھ کی ناموری اور نیک نامی کا دل سے جویا ہو۔ سر شاہ نے اس کے لیے عارضی طور پر مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا

منظور کیا۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے وہی جانتے ہیں کہ سر شاہ نے کس قابلیت اور جانفشانی اور دلسوزی کے ساتھ اس مرحلہ کو طے کیا۔ شکستہ خاطروں کی دلجوئی کی۔ کام کرنے والوں میں کام کرنے کا نئے سر سے ولولہ پیدا کیا اور ان کے وزن و وقار کو دوبارہ زندگی بخشی۔

سر شاہ ایسے قابل بے لوث اور ان تھک کام کرنے والے ہم میں خال خال ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا کام خصوصیت کے ساتھ نہایت پیچیدہ و بے پایاں اور مختلف النوع ہے اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی بات نہیں۔ سر شاہ ہمیشہ ہر ہفتہ اتوار کو یا جب کبھی فیڈرل کورٹ میں چھٹی ہوتی یا ان کو موقع مل جاتا علی گڑھ چلے آتے۔ اور آتے کے ساتھ ہی یہاں کے کاموں میں منہمک ہو جاتے۔ آفس میں قیام کرتے۔ ڈائننگ ہال سے خرید کر کھانا منگاتے اور آفس ہی میں سوتے وہ یونیورسٹی کا ایک پیسہ اپنی ذات پر نہ صرف کرنے بلکہ اس بارے میں وہ اس درجہ محتاط تھے کہ بعض پرانے زمانہ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ دن رات طلباء سٹاف بیرونی عمائد اور اکابر سے سابقہ رہتا۔ ان کی سُنتے اپنی کہتے اور کام نبٹاتے انھوں نے کسی حال میں ملاقات کرنے سے گریز نہ کیا۔

سر شاہ میں کام کرتے رہنے کی کیسی بے پایاں طاقت تھی۔ کیسا ہی مشقت کا کام کر کے اُٹھے ہوں میں نے ان کو ہمیشہ ایسا پایا گویا اچھی طرح آرام کرنے کے بعد پورے ولولہ اور طاقت کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ میں نے کبھی ان کو جمائی یا انگڑائی لیتے نہ پایا۔ بات کرنے یا بات سمجھنے میں کسی نے کبھی یہ محسوس نہ کیا کہ سر شاہ پر کسی قسم کا اضمحلال طاری ہے۔ سر شاہ نے کبھی طنز، غصہ یا آزردگی میں گفتگو نہیں کی حالانکہ ایسے مواقع اکثر آئے جب بحث میں دوسری طرف سے معمولی درجہ کے لوگوں نے

ایسی باتیں روا رکھیں یا ایسا انداز اختیار کیا جن کو معمولی درجہ کا آدمی بھی بڑی مشکل سے انگیز کر سکتا تھا جس طرح ایک تندرست چھوٹے بچے کو چند منٹ کے لیے بھی پورے طور پر ہاتھ پاؤں چلانے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ ٹھیک اسی طور پر سرشاہ سے یہ ناممکن تھا کہ وہ تھوڑی دیر تک بھی اپنے ہاتھ پاؤں آنکھ، شانہ، گردن وغیرہ کو معطل رکھ سکیں۔

سرشاہ اپنے بڑے منصب پر فائز ہونے اور ہر دولت سے بہرہ مند ہونے کے باوجود بیحد متواضع تھے۔ ہر شخص سے ہر وقت ملنے کیلئے تیار رہتے۔ پان سگرٹ سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن یہ چیزیں ہر ملنے والے کو پیش کی جاتیں۔ گرمی میں شربت اور سردی میں چائے سے ضرور تواضع کرتے۔ وہ مشکل کشائی پر آمادہ رہتے وقع الوقتی سے کبھی کام نہ لیتے وہ بڑے آدمی تھے لیکن بڑے آدمیوں کے وطیرہ کے خلاف اپنے اثر و اقتدار سے اپنے آپ کو نفع یا دوسروں کو نقصان پہنچانے کے بجائے ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے۔ سرشاہ کے بارہ میں اُن کا دشمن بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کبھی کسی سازش میں شریک ہو سکتے تھے وہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتے تھے اسلامی روایات اور مشرقی ادب کا بڑا احترام کرتے تھے بڑی صفائی اور سلیقہ سے رہتے تھے۔ کپڑے صاف اور سجل پہنتے تھے۔ پچاس سے متجاوز ہونے کے باوجود جسمانی صحت، خوش دلی، چلت پھرت، چہرہ بشرہ سے وہ کہیں کم عمر نظر آتے تھے۔ میں نے سرشاہ کے سے خوبصورت سفید بال کسی اور کے نہ دیکھے وہ بہت جلد ہنس پڑتے جس میں خلوص اور بے تکلفی ہوتی۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کو دیا بہت کچھ اور لیا کچھ بھی نہیں۔ کاش موت نے اُن کو اتنی مہلت اور دی ہوتی کہ وہ قومی زندگی میں براہ راست ہماری مدد اور رہنمائی کرتے۔

حسن عبداللہ

بھونپو بے وقت بجا۔ دل دھک سے ہو گیا۔ حسن عبداللہ رحلت کر گئے
صرف چند لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ دفعتاً بیمار ہو گئے تھے ورنہ یونیورسٹی کے حلقے
میں کسی شخص کے ذہن میں یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ حسن عبداللہ کی وفات کا اعلان
کیا گیا تھا یا کوئی مر سکتا تھا، سوا حسن عبداللہ کے، وہ ایسے کڑیل جوان تھے جہاں
ہوتے دور سے پتہ لگ جاتا کہ حسن عبداللہ مصروف کار یا پیکار ہیں!

یونیورسٹی کے حال ہی میں "اسٹیورڈ" مقرر ہوئے تھے، اس کام کے علاوہ
یونیورسٹی میں رسد رسانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اپنے اور دوسروں کے
معلوم نہیں کتنے ادر مشاغل اپنا رکھے تھے۔ یونیورسٹی میں کوئی تقریب ہونے والی ہو

دوسروں کے ہاں کوئی انتظام درپیش ہو، شہر میں کوئی جلسہ ہونے والا ہو، علی گڑھ سے
باہر کوئی ہلچل یا ہمہمہ ہو، حسن عبداللہ کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی حیثیت سے پیش پیش
رہتے۔ گفتگو سے، بحث مباحثے سے، ہاتھ پاؤں سے، شعر و شاعری سے،
دل سے، دام سے، دوا دوش سے، زندگی میں کس بلا کی تب و تاب تھی۔!

لمبے تڑنگے، خوش رو، خوش لباس، اکڑنے اور فروتنی دونوں میں یگانہ، نہ آہستہ
بولتے تھے، نہ چپکے سے کام کرتے، ان کی زندگی کے ساز میں دھیما سُر کوئی تھا ہی
نہیں، بڑے شریف گھرانے کے تنہا اُجالا تھے، اخلاق و وضعداری میں کھرے،
مشرقی جس کو محبوب رکھتے اُس کو کوئی نا ملائم کہے تو حسن عبداللہ کا رنگ متغیر
ہو جاتا، پھر نہ وہ اپنا دیکھتے نہ پرایا، نہ چھوٹا نہ بڑا، نہ نیچ نہ اونچ اپنے بس
میں ہوتے نہ دوسرے کے سنبھل جاتے تو قدموں پر سر رکھ دیتے۔

میرے وہ شاگرد تھے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی ہی سے اُردو میں ایم۔اے
کیا تھا۔ پی۔ایچ۔ڈی کی فکر میں لندن گئے۔ لڑائی چھڑ گئی تو سلسلہ منقطع کر کے
ہندوستان واپس آگئے۔ گریجویٹ ہوتے ہی وکالت شروع کر دی تھی، لیکن ان کا
دل اُردو لکھنے پڑھنے میں لگتا تھا۔ کچھ دنوں آگرہ میں اُردو فارسی کے لیکچرر رہے
یہ سب ہوتا اور ہوتا رہا، لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو کا معلم بننے کا حوصلہ
اور ولولہ دل سے نہ نکلا۔ کاش کسی نے ان کی وہ والہانہ تمنا دیکھی ہوتی، جب وہ
اپنے خاص انداز سپردگی میں کہتے تھے، رشید صاحب مجھے کچھ نہ چاہیئے،
مجھے تو آپ شعبہ میں لے لیجئے، میں تنخواہ نہ لوں گا، بلکہ کچھ اپنے پاس سے
دوں گا۔ سب مجھے میرے اللہ اور میرے ابا نے کھانے بھر کو دے رکھا ہے!

میں نے ان کو شعبہ میں لینے کی تحریک بھی کی، لیکن ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا۔ یونیورسٹی نے ان کو نہ چھوڑا، لڑائی کے زمانہ میں رسد رسانی کا جو کام ان کے سپرد کیا گیا تھا وہ اس کو اس انہماک اور سر چکرا دینے والی ایمانداری سے کرتے تھے کہ یونیورسٹی کے حکام کے اس مقولے کا رد کرنا بھی آسان نہ تھا کہ اردو لیکچرر تو آج نہیں کل کوئی نہ کوئی مل جائے گا، حسن عبداللہ جیسا ایماندار مہیر سامان نہ ملے گا۔ یہ بات سچی اور پکی تھی۔ ہم میں سے بڑے سے بڑے بے ایمان کا مقولہ تھا کہ حسن عبداللہ جیسا ایماندار کوئی اور نہ تھا!

حسن عبداللہ جذباتی تھے۔ جتنا جلد چڑ جاتے اتنا ہی جلد من جاتے وہ ہمیشہ چڑتے پہلے تھے منتے بعد میں تھے، اور جب من جاتے تھے تو پھر آپ کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ مولوی نذیر احمد نے (EXPLOSIVE) کا ترجمہ بھک سے اڑ جانے والا مادہ لکھا ہے۔ اس سے پڑھ کر شاید خود انگریزی کا لفظ بھی مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا۔ حسن عبداللہ کے بارے میں بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھک سے اڑ جانے والے شخص تھے۔ اس جلالی صفت کے بعد ان کی جمالی صفت آتی۔ جٹ منانے کے لیے پاؤں پکڑ لیتے، معذرت کے سارے کلمات استعمال کر جاتے اور کام کر دیتے!

میرے سامنے وہ سگریٹ نہ پیتے۔ میں دفعتاً ان کے آفس میں پہنچ جاتا اور وہ سگرٹ پیتے ہوتے تو اسے مسل کر چھپا دیتے یا پھینک دیتے اور سر وقد کھڑے ہو جاتے۔ میں نے ان سے بارہا کہا کہ اس تکلف میں کچھ دھرا نہ تھا، اس سے مجھے آپ ہی سے نہیں، خود اپنے سے بیگانگی کا احساس ہونے لگتا

ہے اور یہ بات میرے لیے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کو بھی اچھا لگتا ہے۔

میں نے ان کو دلجمعی سے آفس میں بیٹھے کبھی نہ پایا۔ کوئی موجود ہے تو اس سے بھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی نہ ہو تو ٹیلیفون ہی پر کسی سے آداب تسلیمات یا مار دھاڑ میں مصروف ہیں۔ ٹیلیفون پر بھی بڑے زور اور دھماکے سے گفتگو کرتے۔ ایک دفعہ میں ان کے آفس پہنچا اور بولا حسن صاحب ذرا لائبریری کو ٹیلیفون کرنا ہے۔ کہنے لگے ٹیلیفون خراب ہے۔ میں نے کہا جبھی تو آپ کے ہاں آیا ہوں۔ اٹینشن ہو گئے۔ اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ وہ نہ صرف ہر نامعلوم حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے بلکہ کہیں اور سے حملہ نہ ہوا تو خود حملہ کر بیٹھیں گے۔ بولے یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی آواز بگڑے ہوئے ٹیلیفون پر بھی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گی اس لیے آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں ..... فوراً جیسے کمر کھول دی، اور ہنس پڑے۔ کہنے لگے قبلہ آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ ماشاءاللہ!

امور شرعیہ میں بڑے بے جھجک اور بے لچک تھے۔ انگلستان میں ٹیوب کے اسٹیشن پر اترے سامنے زینہ تھا، زینہ کے موڑ پر تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی۔ آنے جانے والوں کا ریلا تھا حسن صاحب کو نماز کا وقت یاد آ گیا۔ وہیں نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے، ادھر کا مجمع ادھر اور ادھر کا ادھر، گڑبڑ مچ گئی۔ پولیس سارجنٹ بلایا گیا۔ اس نے پہلے تو کچھ غور کیا پھر کچھ کہا، یہ رکوع میں چلے گئے، وہ دو قدم پیچھے کھسک گئے۔ اس کے بعد سجدے میں

چلے گئے تو اس نے سیٹی بجائی، یہ اُٹھ کھڑے ہوئے تو اُس نے ان کے دونوں شانوں کو جھنجھوڑا، یہ نیت توڑ کر اُس سے گتھ گئے، معاملہ پولیس کمشنر تک تک پہنچا، اُس نے ان کو فہمائش کی کہ شارع عام راستہ چلنے کے لیے ہے، عبادت کے لیے نہیں اور سارجنٹ کو تاکید کی کہ غیر ملکیوں کا بہر حال احترام کرنا چاہیئے۔

یہ واقعہ آجکل کہیں ہندوستان میں ہو جاتا تو اللہ ہی جانتا ہے کیا کچھ نہ ہو جاتا!

شعر کہنے پر بلا کی قدرت تھی، غالبؔ کے دیوانے تھے۔ کیا مجال غالبؔ کو برا یا بھلا کہہ کر ان کے سامنے یا ان کی گلی سے نکل جائیے۔ تقریر کرنے میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، اس کے پیچھے تو جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ آگرہ کسی کام سے گئے تھے، وہیں سے مرض الموت لائے۔ شدت کا بخار چڑھا، ساتھ ہی دست آنے لگے، لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلسہ کر دیا تھا، دوستوں نے بہتیرا سمجھایا کہ موقع تقریر کرنے کا نہ تھا آرام کرنے کا تھا، بالآخر طے یہ پایا کہ صرف معذرت کر کے چلے آئیں گے، معذرت کرنے کھڑے ہوئے تو ½۲ گھنٹے دھواں دھار تقریر کر ڈالی۔ نڈھال ہو گئے۔ بالآخر علی گڑھ لائے گئے، حالت بگڑ چکی تھی، لیکن دوڑ دھوپ علاج معالجے سے طبیعت سنبھل گئی اور لوگوں کو ایک گونہ اطمینان ہو چلا تھا کہ مرض پر قابو پا لیا گیا ہے لیکن وقت پورا ہو چکا تھا دفعتہً طبیعت نے پلٹا کھایا اور اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے!

یونیورسٹی میں غلّے کی فراہمی اور رسد رسانی کا پہلے پہل انتظام مرحوم کے سپرد ہوا تو کیا دیکھتا ہوں ایک دن اپنے بہترین سوٹ میں ملبوس چلے آرہے ہیں۔ میں دیکھ کر مسکرایا تو چوکنّے سے ہو گئے پوچھنے لگے بات کیا ہے، قبلہ آپ کا مسکرانا خالی از علّت نہیں، میں نے کہا، کوئی بات نہیں دل خوش ہو گیا، اس زمانے میں کسی کو اچھے لباس میں دیکھ کر یوں بھی دل باغ باغ ہو جاتا ہے آپ نے اپنے لیے کپڑے کا انتظام کر ڈالا تو میرے لیے غلّہ کی بھی یقیناً فکر رکھیں گے ٹھٹک گئے اور بولے۔ حضور والا یہ سوٹ میں نے انگلستان میں سلوایا تھا میں اسے عمداً پہن کر آیا ہوں اور اپنے دوسرے کپڑے بھی جلد جلد پہن کر دکھا دوں گا۔ تاکہ لوگ کبھی اور دیکھیں تو یہ نہ خیال کریں کہ میں نے یونیورسٹی کا روپیہ کھا کر یہ سب بنوایا ہے اور قبلہ۔ (اب حسن صاحب تیز ہونے لگے تھے) میں نے فلاں صاحب کو اپنا بینک کا حساب بھی دکھا دیا ہے کہ اتنی رقم میری اپنی ہے تاکہ آگے چل کر چہ میگوئیاں نہ شروع ہو جائیں، میں سنجیدہ بن گیا، اور حسن عبداللہ صاحب کو ان کی عاقبت بینی پر مبارکباد دی، ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ حسن صاحب اللہ آپ کی مدد فرمائے لیکن آپ کے قیمتی کپڑوں اور بینک میں بچت کی میزان کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کپڑے منگنی کے ہوں۔ رہی بچت سو یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ آپ نے کسی سے قرض لے کر دکھا دی ہو۔ حسن صاحب برس پڑے، کہنے لگے قبلہ اللہ کے واسطے مجھ پر رحم کیجیے۔ کچھ اور کہنے والے تھے کہ میں ہنس پڑا اور وہ سمجھ گئے اور خود بھی ہنسنے لگے، بولے قبلہ آپ کی انہی باتوں سے تو میں آپ کے سامنے سگرٹ نہیں پیتا، ماشاءاللہ، جزاک اللہ۔ میں نے کہا اچھا کرتے

ہیں میرے سامنے سگریٹ نہیں پیتے، لیکن احتیاطاً عقیدت میں کبھی کبھی عقل کا کھوٹ بھی ملاتے رہیئے، ورنہ کچھ اور پینے لگیں گے۔

پچھلے رمضان میں وائس چانسلر صاحب کے ہاں کچھ لوگ افطار پر مدعو تھے افطار سے پہلے بعض اہم کاموں سے متعلق مشورہ بھی تھا، حسن عبداللہ بھی مدعو تھے لیکن ابھی پہنچے نہ تھے میٹنگ ہو رہی تھی، اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے حسن صاحب کی ایک فروگزاشت یاد کر کے برہمی کا اظہار کیا، اور بار بار کیا، بات کوئی ایسی نہ تھی لیکن جو چیز عجیب سی نظر آئی - وہ یہ ڈاکٹر صاحب اس معاملے کو رہ رہ کر یاد کرتے اور برہم ہوتے، حالانکہ حسن عبداللہ کو موصوف بے حد عزیز رکھتے تھے اور مرحوم بھی ڈاکٹر صاحب کے فدائیوں میں تھے۔ میرا دل بے اختیار چاہا کہ کاش اس وقت حسن عبداللہ آجاتے۔ عجیب اتفاق کہ حسن صاحب آموجود ہوئے، سارا کام چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب نے مواخذہ کرنا شروع کر دیا۔ پہلے تو حسن صاحب اسے معمولی بات سمجھتے تھے لیکن تھوڑی ہی دیر میں سنبھل بیٹھے...........

حاضرین میں قاضی خورشید احمد صاحب ایم، ایس، سی علیگ، ریاضی کے مشہور ماہر بھی تھے جو حال ہی میں یو، پی کے محکمہ تعلیم سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ آگئے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے ہاں مقیم تھے، قاضی صاحب کی زبان میں تھوڑی سی لکنت بھی ہے، جو قاضی صاحب کے بحثنے میں اکثر بڑا لطف پیدا کر دیتی ہے۔ جو لوگ قاضی صاحب کی ذہانت و فطانت سے واقف ہیں وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے مواقع پر قاضی صاحب کی موجودگی کیا رنگ لا سکتی تھی۔ حسن عبداللہ صاحب نے جوابدہی شروع کی۔ ہر شخص خاموش تھا، صرف قاضی صاحب کبھی کبھی سر ہلا دیا

کرتے تھے ۔ مباحثہ میں گرمی آچلی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی طلبی دفعتاً ٹیلیفون پر ہوئی اب مطلع صاف تھا حسن عبداللہ نے قاضی صاحب کی طرف رُخ کیا اور گرج کر بولے اور تو اور آپ کو دیکھیے کس مزے سے گردن ہلاتے تھے قاضی صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ لکنت مانع آئی، میں نے کہا حسن صاحب آپ سمجھے نہیں، قاضی صاحب تو آپ کی حمایت میں گردن ہلاتے تھے، قاضی صاحب نے سٹپٹا کر تنکے کا سہارا لیا، اور بولے، اور نہیں تو کیا! حسن عبداللہ اب جو گرجے ہیں تو زمین سے آسمان تک سو خطن کا باب تھا! قاضی صاحب کسی محفل اور مجمع میں بند ہونے والے لوگوں میں نہ تھے، لیکن اس موقع پر ایسے زچ ہوئے کہ سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ حسن صاحب نے اسی جوش و جلال میں سائیکل اٹھائی اور چل دیئے ۔ ہم سب نے بہتیرا پکارا کہ افطار کرتے جائیے۔ لیکن کون سنتا ہے!

کئی دن بعد ملاقات ہوئی تو ہنسنے لگے ۔ بولے قبلہ، آپ نے خواہ مخواہ مجھے قاضی صاحب سے بھڑا دیا، آپ کا تو کچھ نہ بگڑا، روزے کی جھلاہٹ کی مجھے قاضی صاحب سے معافی مانگنی پڑی ۔

مرحوم بڑے دوست پرست تھے ۔ ان کے بہت سے احباب چھوٹی چھوٹی جگہوں پر تھے لیکن وہ ان کی خاطر اور ان کی حمایت میں بڑے سے بڑے آدمی سے نبرد آزما ہونے کے لیے فوراً سر بکف ہو جاتے ۔ وہ جس کو اچھا یا اپنا محسن سمجھتے تھے اس کے خلاف کبھی کچھ نہ کرتے بلکہ اکثر بے محل اور بے جا پاسداری پر اتر آتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ ادنیٰ کارروائی پر آمادہ کئے جا سکتے تھے، یا ان کی سیرت میں کوئی بنیادی خامی تھی ۔ وہ جذباتی آدمی تھے

جذباتی آدمی بالعموم مخلص ہوتا ہے، اس کے دل میں کھوٹ کپٹ کا بڑی مشکل سے گزر ہوتا ہے۔ طبعاً وہ عوام کے آدمی تھے اور چھوٹوں کی حمایت میں بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت بھاتی تھی!

میرا وہ بہت خیال کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں شگفتگی اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا اور جس شخص کو دیکھ کر میرے دل کی یہ حالت ہوتی ہے اس کے مرنے کا مجھے بڑا غم ہوتا ہے، لیکن اس غم کا مقابلہ اس غم سے کیسے کروں اور کون کر سکتا ہے جو مرحوم کے بوڑھے باپ، بوڑھی ماں، بھائی پر فدا ہونے والی بہنوں، نیک نفس بیوی اور معصوم بچوں کا ہوگا۔ ایسوں کا غم، اور ایسا غم اس رحمتِ بیکراں کی طرف سے مغفرت کی بشارت ہے جس کے جوار میں مرحوم پہنچ گئے! میں کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہوں۔

محمد سرور صدیقی خوش نویس لاہور

حسرت کی شاعری

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

''حسرت نے اپنی عشق بازی کے ساتھ پارسائی کی وضع کو نبھایا اور خوب نبھایا لیکن اس کے ساتھ کبھی بھی جذبے کی اصلیت میں جو شعر کی جان و ایمان ہے کوتاہی نہیں آنے دی۔

چنانچہ حسرت کی غزل سرائی عشق و محبت کی قلبی وارداتوں اور اس کی جاودانی کیفیتوں کی داستان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اس داستان کے ہیرو ہیں۔

اور یہی ''حسرت کی شاعری'' ہے۔ جس میں عشق کی شیفتگی اور حسن کی رعنائی اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

قیمت: دو روپے

آئینۂ ادب لاہور

سرورق رہبر پریس لمیٹڈ، لاہور میں چھپا